غدر دہلی کے افسانوں کا

ساتواں حصہ

غالب کا روزنامچہ

از

مصوّرِ فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی

شائع کنندہ

کارکن حلقۂ مشائخ بک ڈپو دہلی

قیمت ۱۲ ر

سنہ ۱۹۲۴ء

صرف سرورق
نور فائن آرٹ لیتھو پریس دہلی حویلی اعظم خاں میں طبع ہوا

سنہ ۱۳۴۰ھ یا ۱۹۲۲ء میں یہ کتاب پہلی بار چھپی تھی۔ دو سال کے بعد اب شوال ۱۳۴۲ھ مطابق جون ۱۹۲۴ء میں دوسرے ایڈیشن کی نوبت آئی ہے میں انسداد ارتداد کے کام میں اتنا زیادہ مصروف ہوں کہ اپنے تمام تجارتی کاموں کو دیکھنا اور ختم شدہ کتابوں کی نظر ثانی کرنا میرے لئے مشکل ہو گیا ہے۔ اسواسطے اس کتاب کی نظر ثانی بھی جسکا وعدہ پہلے ایڈیشن میں کیا تھا نہ کرسکا۔ بھر حال یہ لکھنا ضروری ہے کہ کتاب مقبول ہوئی۔ اور روزنامچہ کو مکتوبات غالب سے پیدا کرنا اکثر اہل قلم کو بہت پسند آیا۔

پہلے ایڈیشن کے وقت اسکے اٹھویں حصہ کا خیال بھی نہ تھا۔ مگر وہ دہلی کی جانکنی کے نام سے تیار ہوا۔ اور اسقدر پسند کیا گیا کہ اتنے عرصہ میں دو مرتبہ چھپ کر بک چکا ہے۔ گویا پہلے حصہ کی طرح یہ آٹھواں حصہ بھی از حد پسند کیا گیا۔ الحمد للہ علے احسانہ

حسن نظامی
حجرہ ایمان خانہ درگاہ حضرت محبوب الٰہی رضہ
دہلی — یکم مئی ۱۹۲۴ء

۷۸۶ ہوالکل یا معین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غالب کا روزنامچہ غدر

۱۸۵۷ء

غدر دہلی کے افسانوں کا ساتواں حصہ

دیباچہ

غدر ۱۸۵۷ء کے حالات چھ حصوں میں شائع کر چکا ہوں ہر حصہ میں ایک مخصوص بات غدر کے متعلق ہے۔ پہلے حصہ میں وہ قصے ہیں جنکو میں نے بہادر شاہ کے خاندان کی عورتوں، بچوں اور مردوں کی آپ بیتی کیفیت کو ان سے سُنکر یا دوسری جگہ سے معلوم کر کے اپنے طریقہ بیان کے اضافہ سے قلمبند کیا۔ اور کئی بار یہ کتاب چھپی۔ اس حصہ کا نام **آنسوؤں کی بوندیں** ہے۔

دوسرے حصہ میں انگریزوں کی خود نوشت کیفیت ہے یعنی غدر میں ان پر جو مصیبتیں پڑیں اُن کو انھوں نے لکھ لیا۔ اس کا نام **انگریزوں کی بپتا** ہے اور اسکے بھی کئی ایڈیشن شائع ہوتے۔

تیسرے حصہ میں محاصرۂ دہلی کی وہ خط و کتابت ہے جو انگریزی فوج کے انگریز افسروں نے محاصرۂ دہلی کے مقام پر پنجاب کے انگریز افسروں سے کی اس کا نام **محاصرہ دہلی کے خطوط** ہے۔

چوتھے حصہ میں بہادر شاہ بادشاہ کے مقدمہ کی مفصّل روئداد ہے اس کا نام **بہادر شاہ کا مقدمہ** ہے۔

پانچویں میں وہ خفیہ خطوط ہیں جو غدر کے زمانہ میں بادشاہ نے لوگوں کو لکھے اس کا نام **گرفتار شدہ خطوط** ہے۔

چھٹے میں اخبارات کے وہ مضامین ہیں جو زمانۂ غدر میں شائع ہوئے اور جنکو . . غدر میں ایک سبب قرار دیا گیا تھا۔ اسکا نام **غدر دہلی کے اخبار** ہے

اب یہ ساتواں حصہ میرے خیال میں سب حصّوں سے زیادہ دلچسپ، موثر اور دردناک سمجھا جائیگا۔ گو آجکل پہلے حصہ کو جو میرا لکھا ہوا ہے بہت پسند کیا جاتا ہے مگر حق یہ ہے کہ جب غالب کا یہ روزنامچہ شائع ہوگا تو میرا لکھا ہوا پہلا حصہ اسکے سامنے ماند ہو جائیگا۔ کیونکہ میرے لکھے ہوئے حصّہ میں قصّہ کا مبالغہ ہے اور بہت سی باتیں درد کا اثر بڑھانے کو محض فرضی لکھی گئی ہیں میں نے یہ مضامین جو پہلے حصہ میں جمع کرکے شائع کئے گئے ہیں تاریخی حیثیت سے نہیں بلکہ ہندوستانیوں کو عبرت دلانے اور دنیا کا انجام اور نتیجہ دکھانے کے لئے مختلف موقعوں پر لکھے اور مختلف رسائل و اخبارات میں شائع کرائے تھے اسلئے ان میں کسی قسم کی تاریخی اہمیت نہیں ہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ میں نے ان کا نام "افسانے" رکھا ہے تاکہ ان کو تاریخی واقعات نہ سمجھ لیا جائے

غالب کے روزنامچہ میں ایک حرف بھی فرضی نہیں ہے بلکہ چشم دید اصلی حالات کی تصاویر ہیں۔ اور پھر بیان ایسا صاف، ستھرا اور اعلےٰ ہے کہ میری عبارت اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتی۔

غالب کے اس روزنامچہ سے دہلی کی عمارتوں، دہلی کے نامور آدمیوں دہلی کی قدیمی معاشرت، دہلی کے پرانے احساسات کا اتنا بڑا تاریخی ذخیرہ

حاصل ہوتا ہے جو کسی غدر دہلی کی تاریخ میں نہیں ملے گا +

ایک بات نہایت ہی اہم اس روزنامچہ سے ظاہر ہوگی اور وہ یہ ہے کہ غدر کی تاریخ لکھنے والے عموماً یا تو انگریز تھے اور یا انگریزوں کے زیر اثر مورخ اس واسطے اس میں واقعات کا ایک ہی رُخ دکھایا گیا ہے۔ مگر غالب کے روزنامچہ سے تصویر کا دوسرا اور بہت ہی پوشیدہ رُخ بھی ظاہر ہو جائیگا اور مورخوں کو اس سے بہت مدد ملے گی +

یہ روزنامچہ کہاں سے آیا

لوگوں کو حیرت ہوگی کہ غالب کا یہ روزنامچہ کہاں سے آگیا پہلے تو کبھی اس کا ذکر بھی نہیں سُنا تھا۔ اس واسطے میں اس حقیقت کو بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ غالب نے غدر کا کوئی خاص روزنامچہ نہیں لکھا تھا۔ نہ غالباً ان کو روزنامچہ لکھنے کی عادت تھی میں نے یہ روزنامچہ خود تصنیف کیا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ اس تصنیف میں ایک حرف بھی میرا نہیں ہے اور سب غالب کے قلم سے نکلا ہوا ہے +

اس معمہ اور چیستان کا حل یہ ہے کہ غالب کے خطوط میں جہاں جہاں غدر کا ذکر ضمناً آیا تھا میں نے پوری تلاش و محنت سے اسکو الگ کر لیا۔ اور ایسے طریقہ سے چھانٹا کہ روزنامچہ کی عبارت معلوم ہونے لگی بس میرا کمال اسی قدر ہے کہ میں نے بغیر بیشی الفاظ کے خطوط کو روزنامچہ بنا دیا اور کوئی شخص اس کو پڑھ کر خطوط کا شبہ نہیں کر سکتا +

غالب کے مکتوبات مطبوعہ و غیر مطبوعہ میں غدر کی کیفیت ایسی دبی ہوئی پڑی تھی کہ کوئی شخص اس کی خوبی و اہمیت کو محسوس نہ کر سکتا تھا اور خطوں کے ذیل میں ان عبارتوں کو بھی بے توجہی سے پڑھ لیا جاتا تھا +

میں نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ اردو زبان میں غدر دہلی کی یہ لاثانی تاریخ جو موتیوں سے بھی زیادہ بیش قیمت ہے اس طرح دبی ہوئی نہ پڑی رہے۔ اسلئے

اس کو علیحدہ کرنا شروع کیا۔ اور کہیں کہیں اپنے حاشئے بھی لکھے تاکہ آجکل کے لوگوں کو دہلی کی بعض مقامی باتوں سے واقفیت ہو جائے اور جس چیز کا مطلب سمجھ میں نہ آئے حاشیہ کی مدد سے سمجھ لیں +

کوشش کے باوجود غالب کی تحریروں میں بعض باتیں ایسی ہیں جنکا حل میں بھی نہ کرسکا۔ دوسرے ایڈیشن کے موقع پر مزید تحقیق کی توفیق خدا تعالیٰ نے دی تو اس کمی کو پورا کر دیا جائیگا +

ایک نہایت مشکل کام

روزنامچہ کی تیاری میں یہ پیش آیا کہ بعض مکتوبات پر غالب نے تاریخ اور سنہ لکھے ہیں اور بعض پر صرف تاریخ اور دن ہے مگر سنہ نہیں لکھا اور بعض پر نہ سنہ ہے نہ تاریخ ہے اس واسطے ترتیب کا فرض ادا کرنا مشکل ہو گیا۔ کیونکہ کچھ معلوم نہیں ہو سکتا کہ پہلی عبارت کون سی ہے اور دوسری کون سی۔ ناظرین خود اپنی سمجھ سے اس مشکل کو حل کر سکتے ہیں

دوسری مشکل

اس روزنامچہ میں یہ ہے کہ بعض مضامین اور واقعات مکرر بلکہ کئی کئی بار لکھے گئے ہیں خصوصاً پنشن کے حالات بہت جگہ آئے ہیں۔ ان کو میں نے اسلیئے قائم رکھا اور کم نہیں کیا کہ گو واقعہ ایک ہی ہے مگر طرزِ ادا میں ہر جگہ نئی قسم کی خوبی ہے اور غالب نے اپنے ہر مخاطب کو ایسے لطف سے کیفیت لکھی ہے کہ نیا مضمون بنا دیا ہے۔ اور پھر کمال یہ ہے کہ واقعات میں کمی بیشی نہیں ہونے دی جس سے غالب کی صدق بیانی پر پوری روشنی پڑتی ہے

حسن نظامی

۴۹۶

غالب کا روزنامچہ غدر ۱۸۵۷ء

غالب کا نسب نامہ

میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں۔ دادا میرا ماوراءالنہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان آیا سلطنت ضعیف ہوگئی تھی۔ صرف پچاس گھوڑے نقارہ دار نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا۔ ایک پرگنہ سیر حاصل ذات کی تنخواہ اور رسالے کی تنخواہ میں پایا۔ بعد انتقال اسکے جو طوائف الملوکی کا بازار گرم تھا وہ علاقہ نہ رہا۔ باپ میرا عبداللہ بیگ خان بہادر لکھنؤ جاکر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا۔ بعد چند روز حیدرآباد جاکر نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہا کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا۔ راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا۔ وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا۔ نصیر اللہ بیگ خاں میرا چچا حقیقی مرہٹوں کی طرف سے اکبرآباد کا صوبہ دار تھا اس نے مجھے پالا ۱۸۰۶ء میں جرنیل لیک صاحب کا عمل ہوا صوبہ داری کمشنری ہوگئی اور صاحب کمشنر ایک انگریز مقرر ہوا۔ میرے چچا کو جرنیل لیک صاحب نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا۔ چار سو سواروں کا برگیڈیر ہوا۔ ایک ہزار روپیہ ذات کا اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر عین حیات علاوہ سال بھر مرزبانی کے تھی کہ بمرگ ناگاہ مر گیا۔ رسالہ برطرف ہوگیا۔ ملک کے عوض نقدی مقرر ہوگئی۔ وہ اب تک پاتا ہوں۔ پانچ برس کا تھا جو باپ مر گیا۔ آٹھ برس کا تھا جو چچا مر گیا۔ ۱۸۳۰ء میں کلکتہ گیا۔ نواب گورنر جنرل سے ملنے کی درخواست کی۔ دفتر دیکھا گیا۔ میری ریاست کا حال معلوم کیا گیا۔ ملازمت ہوئی۔ سات پارچے اور جیغہ۔ سرپیچ۔ مالائے مروارید یہ تین رقم کا خلعت ملا۔ زاں بعد جب دلی میں دربار ہوا مجھکو بھی خلعت ملتا رہا

بعد غدر بجرم مصاحبت بہادر شاہ دربار و خلعت دونوں بند ہوگئے۔ میری بریت
کی درخواست گزری تحقیقات ہوتی رہی تین برس بعد پنڈ چھٹا اب خلعت معمولی ملا

یہ خلاصہ ہے غالب کے نسب نامہ اور زندگی کے بڑے بڑے واقعات
کا اتنے اختصار سے اتنی بڑی لائف کا ماحصل لکھدینا معمولی بات نہیں
ہے یہ قدرت خدا نے غالب کے قلم کو دی تھی۔

ترک اہل سیف ہوتے ہیں اہل قلم نہیں ہوتے

برٹش گورنمنٹ کے موجودہ متعصب عاقبت کے اندیشہ سے بے بہرہ
وزیراعظم مسٹر لائڈ جارج نے خلافت ڈپوٹیشن ہندوستان کے اراکین
سے کہا تھا کہ ترکوں کو تلوار نچانے کے سوا اور آتا ہی کیا ہے۔ ان میں کوئی
قلمی بہادر پیدا نہیں ہوا اس کے جواب میں غالب و خسرو کو پیش کیا جا سکتا ہے
جو دونوں دہلی درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء میں دفن ہیں کہ
امیر خسرو بھی ترک لاچین تھے۔ اور غالب بھی ترک سلجوقی تھے جیسا کہ
اس عبارت میں انھوں نے خود لکھا ہے۔ اب غالب و خسرو کے
کمالات علمی و شعری اور فضائل فلسفہ وادراک حسن انسانی کو دیکھنا
چاہئے۔ ان کی لاجواب تصنیفات کو پڑھنا چاہیے انگلش قوم کے
علما و فلاسفر زمین جو بات افرادی تھی وہ ان میں مجموعی تھی یعنی
انگریزوں میں ایک خاص فن کا کوئی ماہر ہوتا تھا اور اس فن کے
سبب اس کی عزت ہوتی اور غالب و خسرو مجموعہ کمالات تھے کہ
متعدد فضائل انکے اندر تھے۔

توکیا ہندوستان کے یہ دو مشہور ترک ہندوستانی وفد خلافت
کی طرف سے لائڈ جارج کو یہ جواب نہیں دے سکتے کہ ترک صاحب سیف بھی

ہوتے ہیں اور صاحب قلم بھی۔ تم کو واقفیت حاصل کئے بغیر زبان سے
اتنی بڑی بات کہدینی مناسب نہ تھی کہ تم ساری برطانی قوم کے قائم مقام ہو

غالب کا حلیہ

جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اسکی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھکو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے +

جب ڈاڑھی مونچھ میں بال سفید آگئے تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھکر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسی بھی چھوڑدی۔ اور ڈاڑھی بھی تاکہ اس بھونڈے شہر (دہلی) میں ایک وردی ہے عام۔ ملا، حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقہ، بھٹیارہ، جولاہہ، کنجڑا۔ منھ پر ڈاڑھی سر پہ بال۔ فقیر نے جس دن ڈاڑھی رکھی اسی دن سر منڈایا۔

اس سے معلوم ہوا جوانی میں بہت طرح دار جوان تھے۔ ڈاڑھی منڈاتے تھے اور اس وقت کے دستور کے موافق دانتوں پر مسی بھی ملتے تھے۔

غالب کی ازلی طبیعت

علم و ہنر سے عاری ہوں لیکن پچپن برس سے محو سخن گزاری ہوں۔ مبدء فیاض کا مجھ پر احسان عظیم ہے۔ ماخذ میرا صحیح اور طبع میری سلیم ہے۔ فارسی کے ساتھ ایک مناسبت ازلی اور سرمدی لایا ہوں۔ مطابق اہل پارس کے منطق کا بھی مزہ ابدی لایا ہوں۔ مناسبت خداداد۔ تربیت اُستاد حُسن و قبح ترکیب پہچاننے، فارسی کے غوامض جاننے لگا +

غالب کا مجموعہ کلام

میرا کلام کیا نظم کیا نثر کیا اُردو کیا فارسی کبھی کسی عہد

ہیں میرے پاس فراہم نہیں ہوا۔ دو چار دوستوں کو اس کا التزام تھا کہ وہ سودات مجھ سے لیکر جمع کر لیا کرتے تھے۔ سو ان کے لاکھوں روپئے کے گھر لٹ گئے جس میں ہزاروں روپے کے کتب خانے بھی گئے۔ اُسی میں وہ مجموعہ ہائے پریشان بھی غارت ہوئے +

غدر کی نسبت غالب کی تصنیف

میں نے آغاز یاز دہم مئی ۱۸۵۷ء سے یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک رداد شہر اور اپنی سرگزشت یعنی ۱۵ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے اور اس کا التزام کیا ہے کہ وساتیر کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے جو نظم اس نثر میں درج ہے۔ وہ بھی بے آمیزش لفظ عربی ہے۔ ہاں اشخاص کے نام نہیں بدلے۔

یہ کتاب دستنبو کا ذکر ہے۔ آگے بھی جگہ جگہ اس کی کیفیت مذکور ہوئی ہے اور غالباً اسی کتاب کو دیکھنے کے بعد انگریزی حکام اعلیٰ کو غالب کی قدر ہوئی اور شروع کی بیزاری، نفرت اور حقارت اور شبہ جاتا رہا جسکا ذکر کئی جگہ آیا ہے۔ کیونکہ دستنبو دیکھنے سے پہلے گورنر اور دیگر حکام انگریزی غالب کو معمولی شاعر اور بھاٹ خیال کرتے ہونگے اور بہادر شاہ کا سکہ کہنے کے سبب اور قلعہ میں جانے آنے کی وجہ سے ان پر پورا شبہ باغیانِ غدر سے میل جول کا ہوگا۔ مگر جب کتاب دستنبو پڑھی گئی ہوگی اور اس سے غالب کی قابلیت اور غدر سے بے تعلقی ظاہر ہوئی ہوگی تب گورنر اور حکام انگریزی نے پنشن جاری کی ہوگی +

غالب چشتی نظامی تھے شیعہ نہ تھے

میاں نصیر الدین اولاد میں سے ہیں شاہ محمد اعظم صاحب کی وہ خلیفہ تھے مولوی فخر الدین صاحب کے۔ اور میں مُرید ہوں اس خاندان کا +

غالب کی نسبت شہرت ہے کہ وہ اثنا عشری شیعہ تھے۔ اور مکتوبات میں انہوں نے خود بھی ایک جگہ لکھا ہے کہ میں اثنا عشری ہوں مگر یہاں وہ لکھتے ہیں کہ میں مولوی فخر الدین صاحب کے خاندان کا مرید ہوں۔ جو چشتیہ نظامیہ سلسلہ کے مشہور بزرگ تھے۔ درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین صاحبؒ میں ان کا مزار ہے اور وہ فرزند تھے حضرت مولانا نظام الدینؒ اورنگ آبادی کے اور غالب کے اکثر احباب اور ہارو کا خاندان بھی حضرت مولٰنا فخر صاحبؒ مذکور کے سلسلہ میں مرید تھا۔ میاں کالے صاحب انہی مولٰنا فخر صاحب کے پوتے تھے۔ جو بہادر شاہ کے پیر سمجھے جاتے تھے اور اسی وجہ سے ان کی املاک و جائداد کی ضبطی ہوئی جیسا کہ غالب نے اسی روزنامچہ میں لکھا ہے +

پس اگر غالب چشتی نظامی سلسلہ میں مُرید تھے تو شیعہ کیونکر ہو سکتے تھے کیونکہ شیعہ مرید نہیں ہوا کرتے۔ مگر انہوں نے خود لکھا ہے کہ میں اثنا عشری ہوں اس مشکل کا حل یہ ہے کہ چشتی نظامی فقرا اور ان کے مرید میں محبت اہلبیت میں بہت غلو رکھتے ہیں۔ اور بارہ اماموں سے بھی تعلق خاص رکھتے ہیں اس بنا پر غالب نے اپنے آپ کو اثنا عشری یعنی بارہ ائمہ کا ماننے والا لکھا ورنہ وہ شیعہ نہ تھے شیعہ ہوتے تو مرنے کے بعد علی گنج شاہ مرداں کے قبرستان میں دفن ہوتے جو صفدر جنگ کے قریب ہے اور جہاں اس وقت کے

تمام شیعہ اُمرا دفن ہوا کرتے تھے۔ اور اب بھی ہوتے ہیں سُنیّوں خصوصًا چشتیوں نظامیوں کے قبرستان میں دفن ہونا اور درگاہ حضرت سلطانجی صاحب میں جو نظامیہ سلسلہ کے بانی ہیں ان کی میت کا لایا جانا ظاہر کرتا ہے کہ وہ سنّی تھے شیعہ نہ تھے۔ انکی قبر بھی سنّی طریقہ کی بنائی گئی ہے یعنی اس پر اونچا اونٹ کے کوہان کی صورت کا خشتی تعویذ بنایا گیا ہے شیعوں کی قبریں زمین کے برابر ہوتی ہیں۔ ابھرا ہوا یا اونٹ کے کوہان کی شکل کا تعویذ ان کے ہاں نہیں بنایا جاتا۔

غالب کی قبر پہ تاریخ میر مجروح کی کہی ہوئی کندہ ہے۔ جو غالب کے شاگرد اور شیعہ مذہب رکھتے تھے۔ وہ تاریخ یہ ہے۔

کل میں غم و اندوہ میں باخاطرِ محزوں — تھا تربت استاد پہ بیٹھا ہوا غمناک
دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی مجروح — ہاتف نے کہا گنج معانی ہے تہ خاک
۱۲۸۵ھ

تباہی قلعہ کی پیشین گوئی

مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ہوتا قلعہ میں شہزادگانِ تیموریہ جمع ہو کر کچھ غزلخوانی کر لیتے ہیں میں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا۔ اور یہ صحبت خود چند روزہ ہے اسکو دوام کہاں؟ کیا معلوم ہے اب کے نہ ہو اور اب کے ہو تو آیندہ نہ ہو۔

یہ تحریر غدر سے پہلے کی ہے۔ لال قلعہ اور اس کے باشندوں کی نسبت جس انداز سے لکھتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شہزادوں کے اطوار اور ملک کی سیاست کے رُخ کو دیکھکر غالب نے سمجھ لیا تھا کہ اب یہ رونق چند روز کی مہمان ہے گو غدر کی خبر غالب کو نہ تھی کہ غیب کا علم نہ جانتے

تھے۔ پھر بھی آثار و قرائن سے انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ انگریز اب اِس
بادشاہی کھلونہ کو سامنے سے ہٹا دینا چاہتے ہیں جب ہی تو انہوں نے
صاف صاف لکھدیا کہ "یہ صحبت چند روزہ ہے اس کو دوام کہاں؟"
اور یہ لکھکر تو انہوں نے پیش گوئی کا کمال ظاہر کردیا کہ "کیا معلوم اب کے
نہ ہوا ور اب کے ہو تو آیندہ نہو" گویا غالب کو قلعہ کی تباہی کا اتنا یقین
تھا کہ ایک دو سال کی قید بھی انہوں نے لگادی۔
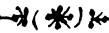
اب دہلی میں کون رہتا ہے؟

کہتے ہیں دلی بڑا شہر ہے۔ ہر قسم کے
آدمی وہاں بہت ہوں گے۔ مگر اب یہ
وہ دلی نہیں ہے بلکہ ایک کمپ ہے مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ۔ باقی سراسر
ہنود و معزول بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں۔ وہ پانچ پانچ روپے مہینہ پاتے
ہیں اناث میں سے جو پیرزن ہیں۔ وہ کٹنیاں اور جو انین کسبیاں۔ امرائے اسلام
میں سے اموات گنو حسن علی خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا سو روپے کا پنشن دار
سو روپے مہینے کا روزینہ دار بنکر نامراد بن گیا میر ناصر الدین باپ کی طرف سے
پیرزادہ نانا اور نانی کی طرف سے امیرزادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان بخشی محمد علی خاں
کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے۔ بیمار پڑا۔ نہ دوا نہ غذا۔ انجام کار مر گیا۔ ناظر حسین مرزا
جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آگیا ہے اس کے پاس ایک پیسہ نہیں۔ ٹکے کی آمد نہیں
مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے۔ مگر دیکھیے چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔ بڈھے صاحب
ساری املاک بیچکر نوش جان کرکے بیک بینی و دو گوش بھرتپور چلے گئے۔ ضیاء الدین کی
پانسو روپے کی املاک واگزاشت ہوکر پھر قرق ہوگئی۔ تباہ خراب پھر لاہور گیا وہاں
پڑا ہوا ہے۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڈھ اور بلب گڈھ

اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ روپیہ کی ریاستیں مٹ گئیں شہر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں۔ ہنرمند آدمی کیوں پایا جائے۔ جو حکما کا حال ہے وہ بیان واقع ہے۔

جو لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اب دہلی میں نہ صاحب اخلاق و مروت ہیں، نہ علم و ہنر والے ہیں، نہ امرا ہیں، نہ شعرا ہیں۔ نہ پہلے سے علما و فقرا نظر آتے ہیں۔ ان کو غالب کی یہ تحریر پڑھنی چاہئے کہ غدر نے ان سب کا خاتمہ کر دیا۔ اور ایسا تباہ کیا کہ آج تک اس شہر میں وہ پہلی سی بات پیدا نہ ہو سکی +

اب دہلی میں دہلی والے کہاں ہیں ؟ پردیسی لوگ آباد ہیں دہلی والے یا تو پھانسیوں پر لٹک گئے یا جلا وطن ہو گئے۔ پھر اس غریب شہر کو بدنام کرنا اور اس کو قدیمی ناموری اور شہرت کی نظر سے دیکھنا بے عقلی نہیں تو کیا ہے!۔

غالب نے یہ تحریر ایسے درد سے لکھی ہے کہ دل پاش پاش ہوا جاتا ہے۔ غم کا نقشہ مجسم ہو کر آنکھوں کے راستہ دل میں گھسا چلا آتا ہے۔

ہندوستان غدر کے بعد

ہندوستان کا قلمرو بے چراغ ہو گیا لاکھوں مر گئے۔ جو زندہ ہیں ان میں سینکڑوں گرفتار بند بلا ہیں۔ جو زندہ ہے اس میں مقدور زندگی نہیں +

اب دہلی میں ساہوکاروں کے سوا کوئی امیر نہیں ہے۔

مسلمان امیروں میں تین آدمی۔ نواب حسن علی خاں۔ نواب حامد علی خاں حکیم احسن اللہ خاں، سو ان کا یہ حال ہے کہ رہتی ہے تو کپڑا نہیں۔ معہذا یہاں کی اقامت

ہیں متذبذب۔ خدا جانے کہاں جائیں۔ سوائے ساہوکاروں کے یہاں کوئی امیر نہیں ہے

(*)

غدر کے بعد غالب نے دہلی کے مسلمان امرا کی تباہی کا جو جگہ جگہ نقشہ دکھایا ہے وہ آج تک اصلی خط و خال میں موجود ہے کہ خاندانی مسلمان امیر ایک نہیں رسا ساہوکار امیر ہزار ہیں۔ خواہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ تجارت کا تمول نظر آتا ہے حکومت کی موروثی امیری خواب و خیال ہو گئی۔

(*)

نواب فرخ میرزا کا بچپن

پرسوں فرخ میرزا آیا اس کے ساتھ اس کا باپ بھی تھا۔ پوچھا کیوں صاحب میں تمہارا کون ہوں، اور تم میرے کون ہو۔ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا حضرت آپ میرے دادا اور میں آپ کا پوتا ہوں۔ پھر میں نے پوچھا کہ تمہاری تنخواہ آئی؟ کہاں جناب عالی آکا جان کی تنخواہ آگئی ہے۔ میری نہیں آئی میں نے کہا لوہارو جائے تو تنخواہ پائے کہا حضرت میں تو آکا جان سے روز کہتا ہوں کہ لوہارو چلو اپنی حکومت چھوڑ کر دلی کی رعیت میں کیوں مل گئے۔

سبحان اللہ بالشت بھر کا لڑکا اور یہ فہم درست اور طبع سلیم میں اسکی خوبی خو اور فرخی سیرت پر نظر کر کے اسکو فرخ سیر کہتا ہوں۔

(*)

یہ نواب فرخ مرزا والی لوہارو کا ذکر ہے جن کو برٹش گورنمنٹ سے سر کا خطاب ہے اور توپوں کی سلامی دی جاتی ہے۔ اور اعلیٰ درجہ کے والیانِ ریاست کے برابر اعزاز کیا جاتا ہے۔ درمیانہ قد ہے۔ گورا رنگ کٹورا سی آنکھیں۔ بڑی اور چڑھی ہوئی ڈاڑھی۔ بال سفید ہو گئے ہیں نہایت

خلیق و ملنسار رئیس ہیں۔ اردو ایسی بولتے ہیں کہ آدمی بیٹھا حیرت سے منہ دیکھا کرے۔ مولانا شبلی حسرت سے کہا کرتے تھے کہ فرصت ہو تو فرخ میرزا کی باتیں سُنئے کہ اصل اردو داں کی باتوں میں ہے۔

غالب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، فرخ میرزا بچپن سے ہونہار تھے۔ ایک فقرہ تو اس غضب کا غالب سے کہا کہ آجکل لوگ سنیں تو متعجب ہوں۔ کیونکہ جنگ یورپ کے زمانہ میں جب نواب فرخ میرزا بصرہ گئے تو عوام نے مشہور کیا کہ وہ انگریزوں کی مدد کرنے گئے ہیں اور انہوں نے اسلامی حکومت کے درد کی پروا نہ کی۔ غالب کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ فرخ میرزا طفلی سے ذاتی اور اسلامی حکومت کی خوبی کو محسوس کرتے تھے جب ہی تو انہوں نے کہا دادا اپنی حکومت چھوڑ کر دتی کی رعیّت میں کیوں مل گئے"

مگر آفریں ہے فرخ میرزا کی بلاغت پر اس وقت بھی پہلو بچا کر بات منہ سے نکالی۔ دلی کی رعیّت کہا انگریزی رعیّت نہ کہا۔

(✻)

اینٹ سے اینٹ بجا دی

کل پنجشنبہ ۵ رمئی کو اوّل روز پہلے بڑے زور کی آندھی آئی پھر خوب منہ برسا۔ وہ جاڑا پڑا کہ تمام کرۂ شہر زمہریر ہوگیا۔ بڑے دریبہ کا دروازہ ڈھایا گیا۔ قابل عطار کے کوچہ کا بقیہ مٹایا گیا کشمیری کٹڑہ کی مسجد زمین کا پیوند ہوگئی۔ سڑک کی وسعت دوچند ہوگئی اللہ اللہ گنبد مسجدوں کے ڈہائے جاتے ہیں اور ہنود کی ڈیوڑھیوں کی جھنڈیوں کے پرچم لہراتے ہیں۔ ایک شیر زور آور اور سلیتن بند رپیدا ہوا ہے۔ مکانات جابجا ڈہاتا پھرتا ہے فیض اللہ خاں بنگش کی حویلی پر جو جو گلدستے ہیں جسکو عوام گمزی کہتے ہیں۔ انہیں

سے ہلا ہلا کر ایک ایک کی بنا ڈھادی۔ اینٹ سے اینٹ بجادی۔ واہ رے بندر یہ زیادتی اور پھر شہر کے اندر۔ ریگستان کے ملک سے ایک سردار زادہ کثیر العیال عسیر الحال عربی، فارسی، انگریزی تین زبانوں کا عالم دلی میں وارد ہوا ہے بلیماروں کے محلہ میں ٹھیرا ہے۔ بحسب ضرورت حکام شہر سے مل لیا ہے باقی گھر کا دروازہ بند کیے بیٹھا رہتا ہے۔ گاہ گاہ نہ ہر شام و بگاہ غالب علی شاہ کے تکیہ پر آجاتا ہے۔

تم سے گورنمنٹ کو ملاقات کبھی منظور نہیں

غدر کے رفع ہونے اور دلی کے فتح ہونے کے بعد میرا پنشن کھلا۔ چڑھا ہوا روپیہ دام دام ملا۔ آیندہ کو بدستور بے کم و کاست جاری ہوا مگر لارڈ صاحب کا دربار اور خلعت جو معمولی و مقرری تھا مسدود ہو گیا۔ یہاں تک کہ صاحب سکرٹر بھی مجھ سے نہ ملے اور کھلا بھیجا کہ اب گورنمنٹ کو تم سے ملاقات کبھی منظور نہیں۔ میں فقیر متکبر مایوس دائمی ہو کر اپنے گھر بیٹھ رہا اور حکام شہر سے بھی ملنا موقوف کر دیا۔ بڑے لارڈ صاحب کے ورود کے زمانہ میں نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب بھی دلی آئے۔ دربار کیا۔ خیر کرو مجھکو کیا ناگاہ دربار کے تیسرے دن بارہ بجے چپراسی آیا۔ اور کہا کہ نواب لفٹنٹ گورنر نے یاد کیا ہے۔ سوار ہو گیا پہلے صاحب سکرٹر بہادر سے ملا۔ پھر نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تصور میں کیا بلکہ تمنا میں بھی جو بات نہ تھی وہ حاصل ہوئی یعنی عنایت سے عنایت۔ اخلاق سے اخلاق وقت رخصت خلعت دیا اور فرمایا کہ ہم تجھکو اپنی طرف سے از راہ محبت دیتے ہیں۔ اور مژدہ دیتے ہیں کہ لارڈ صاحب کے دربار میں بھی تیرا نمبر اور خلعت کھل گیا انبالہ دربار میں شریک ہو خلعت پہن۔

باوجود اسکے کہ حکام گورنمنٹ نے کہدیا تھا کہ ملاقات کبھی منظور نہیں پھر

پھر غالب کے استقلال اور لگاتار جدوجہد نے اس "کبھی نہیں کے" قلعہ کو فتح کر لیا اور ملاقاتیں ہونے لگیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ انگریزی آئین میں قطعی فیصلہ طے شدہ امر اور کبھی نہیں بھی بدل جاتے ہیں۔ اگر سامنے والا مسلسل جدوجہد کرتا رہے۔ مسٹر مارلے نے کہا تھا تقسیم بنگال طے شدہ امر ہے۔ اس کی منسوخی محال ہے۔ مگر بنگالیوں کی کوشش نے اس کو منسوخ کرا کے چھوڑا۔

———✻———

غالب کی چند کتب

پنج آہنگ کے دو چھاپے ہیں ایک بادشاہی چھاپہ خانہ کا اور ایک منشی نور الدین کے چھاپے خانہ کا پہلا ناقص ہے۔ دوسرا سراسر غلط ہے۔ ضیاء الدین خاں جاگیر دار لوہارو میرے سیبی بھائی اور میرے شاگرد رشید ہیں جو نظم و نثر میں نے کچھ لکھا وہ انہوں نے لیا۔ اور جمع کیا۔ چنانچہ کلیاتِ نظم فارسی چوّن پچپن جزو اور پنج آہنگ اور مہر نیم روز اور دیوان ریختہ سب ملکر سوسوا سو جزو مطلے اور مذہب اور انگریزی ابری کی جلدیں الگ الگ کوئی ڈیڑھ سو دو سو روپے کے صرف میں بنوائیں۔ میری خاطر جمع کہ کلام میرا سب ایک جا ہے۔ پھر ایک شاہزادہ نے اس مجموعہ نظم و نثر کی نقل کی۔ اب دو جگہ میرا کلام اکٹھا ہوا۔ کہاں سے یہ فتنہ برپا ہوا اور شہر لٹے وہ دونوں جگہ کا کتاب خانہ خوانِ یغما ہو گیا۔ ہر چند میں نے آدمی دوڑائے کہیں سے ان میں سے کوئی کتاب ہاتھ نہ آئی۔ وہ سب قلمی ہیں۔ جناب ہنری اسٹورٹ ریڈ صاحب کو ابھی میں خط نہیں لکھ سکتا۔ ان کی فرمایش ہے۔ اردو کی نثر انجام پائے تو اس کے ساتھ ان کو خط لکھوں مگر اردو میں اپنے قلم کا زور کیا صرف کروں گا۔ اور اس عبارت میں معانی نازک کیونکر بھروں گا۔

باوجود اس کسر نفسی کے غالب کی اُردو میں وہ زور ہے کہ آجتک
باوجود ترقی اُردو کے کوئی شخص ان کا ہمسر اردو لکھنے میں پیدا نہیں ہوا۔

مقتولوں اور مہجوروں کی یاد

غم مرگ میں قلعہ نامبارک سے قطع نظر کرکے اہل شہر کو گنتا ہوں۔ مظفرالدولہ۔ میر ناصر الدین۔ مرزا عاشور بیگ میرا بھانجا اس کا بیٹا۔ احمد مرزا۔ انیس برس کا بچہ مصطفےٰ خاں ابن اعظم الدولہ اسکے دو بیٹے ارتضےٰ خان اور مرتضےٰ خاں۔ قاضی فیض اللہ۔ کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کی برابر نہیں جانتا تھا۔ اے لو بھول گیا حکیم رضی الدین خاں۔ میر احمد حسین میکش اللہ اللہ۔ ان کو کہاں سے لاؤں۔ غم فراق حسین مرزا۔ میر مہدی۔ میر سرفراز حسین۔ میرن صاحب خدا ان کو جیتا رکھے کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے وہاں خوش ہوتے۔ گھران کے بے چراغ۔ وہ خود آوارہ سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ کہنے کو ہر کوئی ایسا کر سکتا ہے مگر میں علیؑ کو گواہ کرکے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے۔

فقیر اور ہتھیار نہ آئے

بھائی فضلو عرب سرا میں رہتے ہیں۔ پرسوں سے آئے ہوئے ہیں۔ دوڑتے پھرتے ہیں۔ عرضیاں دیتے پھرتے ہیں۔ کوئی سنتا نہیں۔ آمد و رفت کا ٹکٹ موقوف ہو گیا۔ فقیر اور ہتھیار جس پاس ہوں وہ نہ آئے۔ اور باقی ہندو مسلمان عورت مرد سوار پیادہ جو چاہے چلا جائے چلا آئے۔ مگر رات کو شہر میں رہنے نہ پائے وہ شور و غل تھا کہ سڑکیں نکلیں گی۔ اور گوروں کی چھاؤنی بنے گی۔ کچھ بھی نہ ہوا۔ سر پٹ کر ایک جان نثار خاں کے چھتے کی سڑک نکلی ہے۔ دِلّی والوں نے لکھنؤ کا خاکہ اڑا رکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ

لاکھوں مکان ڈھا دیئے۔ اور صاف میدان کر دیا۔ میں جانتا ہوں ایسا نہ ہوگا۔

امن عام کے بعد بھی فقیر اور ہتھیار والے کا شہر کے داخلہ سے ممنوع ہونا ظاہر کرتا ہے کہ حکام انتظامی ضرورت سے ایسا کرنے پر مجبور تھے کیونکہ بغاوت کے وقت اکثر باغیوں نے فقیروں کے لباس میں دورہ کر کے غدر کی آگ بھڑکائی تھی۔

امام باڑہ کا انہدام

آغا باقر کا امام باڑہ اس سے علاوہ کہ خداوند کا عزا خانہ ہے ایک بنائے قدیم، رفیع مشہور۔ اس کے انہدام کا غم کس کو نہ ہوگا۔ یہاں دو سڑکیں دوڑتی ہیں۔ ایک ٹھنڈی سڑک اور ایک آہنی سڑک۔ محل ان کا الگ الگ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ گوروں کا بارگ بھی شہر میں بنے گا اور قلعہ کے آگے جہاں لال ڈگی ہے۔ ایک میدان نکالا جائیگا۔ محبوب کی دکانیں۔ بھیلیوں کے گھر، فیل خانہ، بلاقی بیگم کے کوچہ تک سوائے لال ڈگی اور دو چار کنوں کے آثار عمارت باقی نہ رہے گی۔ آج جان نثار خاں کے چھتے کے مکان ڈھنے شروع ہوگئے ہیں۔ کیوں میں دلی کے ویرانہ سے خوش نہ ہوں جب اہل شہر ہی نہ رہے۔ شہر کو کیا چولہے میں ڈالوں۔

پشم نہیں اکھیڑ سکتا

زبان زد خلق ہے کہ قدیم نوکروں سے باز پرس نہیں مشاہدہ اس کے خلاف ہے سالے کوئی دن ہوتے کہ حمید خاں گرفتار آیا ہے۔ پاؤں میں بیڑیاں۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں۔ حوالات میں ہے دیکھئے کہ حکم اخیر کیا ہو۔ صرف تونندے رائے کی مختار کاری پر قناعت کی گئی جو کچھ ہونا ہے وہ ہو رہیگا۔ ہر شخص کی سرنوشت کے موافق حکم ہو رہے ہیں۔ نہ کوئی

قانون ہے نہ قاعدہ ہے۔ نہ نظیر کام آئے نہ تقریر پیش جائے۔ ارتضےٰ خاں ابن مرتضےٰ خاں
کی پوری دوسو روپے کی پنشن کی منظوری کی رپورٹ گئی۔ اور انکی دو بہنیں سو سو روپے
مہینہ پانے والیوں کو حکم ہوا کہ چونکہ تمہارے بھائی مجرم تھے تمہاری پنشن ضبط۔
بطریق ترحم دس دس روپئے مہینہ تم کو ملیگا۔ ترحم یہ ہے تو تغافل کیا قہر ہوگا
میں خود موجود ہوں اور حکام صدر کا روشناس پشم نہیں اکھیڑ سکتا۔ ۳۵ برس کا
پنشن۔ تقرر اس کا تجویز لارڈ لیک و بمنظوری گورنمنٹ۔ اور پھر نہ ملا ہے نہ ملیگا
خیر احتمال ہے ملنے کا۔

پشم کا لفظ آجکل بے تہذیبی میں داخل سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس زمانہ میں سب
لکھتے اور بولتے تھے۔ غالب نے لکھا تو دستور عام کے سبب لکھا
ورنہ ان کی عادت فحش نویسی کی نہ تھی۔
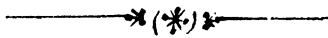
سب کچھ تم

اب تو فکر یہ پڑی ہوئی ہے کہ رہیے کہاں۔ اور کھائیے کیا؟
مولنا کا حال معلوم ہوا۔ مرافعہ میں حکم دوام حبس بحال رہا۔ بلکہ تاکید ہوئی کہ جلد دریائے
شور کی طرف روانہ کرو ان کا بیٹا ولایت میں اپیل چاہتا ہے۔ کیا ہوتا ہے۔ جو ہونا
تھا سو ہولیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ دہلی اردو اخبار کا پرچہ اگر مل جائے تو بہت
مفید مطلب ہے۔ ورنہ خیر کچھ محل خوف و خطر نہیں ہے حکام صدر ایسی باتوں پر نظر
نہ کریں گے۔ میں نے سکہ کہا نہیں۔ اگر کہا تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا
یہ گناہ نہیں۔ اور اگر گناہ بھی ہے تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکہ معظمہ کا اشتہار بھی
اس کو نہ مٹا سکے۔ سبحان اللہ! گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانی اور بنک
گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہوجائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں؟

ہاں صاحب گولہ کا بہنوئی مددگار ہے اور شاعر کا سالہ بھی جانب دار نہیں۔

ایک لطیفہ پرسوں خوب ہوا۔ حافظ ممّوں بے گناہ ثابت ہو چکے۔ رہائی پا چکے۔ حاکم کے سامنے حاضر ہوا کرتے ہیں۔ املاک اپنی مانگتے ہیں قبض و تصرف تو ان کا ثابت ہو چکا ہے۔ صرف حکم کی دیر۔ پرسوں وہ حاضر ہیں۔ مثل پیش ہوئی حاکم نے پوچھا کہ حافظ محمد بخش کون ہے؟ عرض کیا کہ میں پھر پوچھا کہ حافظ ممّوں کون؟ عرض کیا کہ میں اصل نام میرا محمد بخش ہے۔ ممّوں ممّوں مشہور ہوں۔ فرمایا کچھ بات نہیں۔ حافظ محمد بخش بھی تم۔ اور حافظ ممّوں بھی تم۔ سارا جہاں بھی تم۔ جو دنیا میں ہے وہ بھی تم۔ ہم مکان کس کو دیں مثل داخل دفتر ہوئی۔ میاں ممّوں اپنے گھر چلے آئے۔

بات معمولی تھی۔ حاکم کو اس کا سمجھنا دشوار نہ تھا کہ حافظ محمد بخش نام تھا اور لوگ ممّوں ممّوں کہتے تھے۔ پھر جو جائداد نہ دی گئی تو غالباً کوئی اور وجہ ہوگی۔ ورنہ اتنی سی بات پر حقدار کو اس کے حق سے محروم کرنا سمجھ میں نہیں آتا۔

احکامِ قضا و قدر

سُنا ہے کہ ایک محکمہ لاہور میں معاوضہ نقصانِ رعایا کے واسطے تجویز ہوا ہے۔ اور حکم یہ ہے کہ جو رعیت کا مال کالوں نے لوٹا ہے۔ البتہ اس کا معاوضہ بحساب وہ یک سرکار سے ہوگا یعنی ہزار روپے کے مانگنے والے کو سو روپے ملیں گے۔ اور جو گوروں کے وقت کی غارتگری ہے وہ مدر[1] اور محل ہے اس کا معاوضہ نہ ہوگا۔ شاید یہ دہی کمشنر ہوں مکانات حامد علی خاں تو مدت سے ضبط ہو کر سرکار کا مال ہو گئے۔ باغ کی صورت بدل گئی۔ محلسرا اور کوٹھی میں گورے رہتے تھے۔ اب پھاٹک اور سرتا سر دکانیں

[1] اس کے معنی معاف اور ناقابل گرفت کے ہیں۔

گرادی گئیں۔ سنگ و خشت کا نیلام کر کے روپیہ داخل خزانہ ہوا جب بادشاہ اودھ کی املاک کا وہ حال ہو تو رعیت کی املاک کو ن پوچھتا ہے جو احکام کہ دلی میں صادر ہوئے ہیں وہ احکام قضا و قدر ہیں ان کا مرافعہ کہیں نہیں۔ گویا ہم نہ کبھی کہیں کے رئیس تھے نہ جاہ و حشم رکھتے تھے۔ نہ املاک رکھتے تھے۔

دہلی کی چنگی کے پہلے ملازم

آجکل یہاں پنجاب احاطہ کے بہت حاکم فراہم ہیں۔ پون ٹوٹی کے باب میں کونسل ہوئی۔ پرسوں ، رنومبر سے جاری ہوگئی سالگ رام خزانچی چھنا مل۔ مہیش داس ان تینوں شخصوں کو یہ کام بطریق امانی سپرد ہوا ہے۔ غلہ اور اُپلے کے سوا کوئی چیز ایسی نہیں کہ جس پر محصول نہ ہو۔ آبادی کا حکم عام ہے۔ خلق کا اژدہام ہے۔ آگے حکم تھا کہ مالکان مکان رہیں کرایہ دار نہ رہیں۔ پرسوں سے حکم ہو گیا کہ کرایہ دار بھی رہیں۔ مگر کرایہ سرکار کو دیں۔ حکام بے پروا مختار کار۔ عدیم الفرصت میں پاشکستہ محمد قلی خاں کبھی یہاں۔ کبھی وہاں۔ وقت پر موقوف ہے۔ حکیم احسن اللہ خاں کے مکانات شہر ان کو مل گئے اور یہ حکم ہے کہ شہر سے باہر نہ جاؤ۔ دروازہ سے باہر نہ نکلو اپنے گھر میں بیٹھے رہو۔ نواب حامد علی خان کے مکانات سب ضبط ہو گئے۔ وہ قاضی کے حوض پر کرایہ کے مکانات میں مع متوعہ کے رہتے ہیں۔ باہر جانے کا حکم ان کو بھی نہیں۔ مرزا الٰہی بخش کو حکم کرانچی بندر جانے کا ہے۔ انہوں نے زین پکڑی ہے سلطانجی میں رہتے ہیں عذر کر رہے ہیں۔ دیکھئے یہ جبر اُٹھ جائے یا یہ خود اٹھ جائیں۔

لالہ سالگرام وچھنا مل صاحب اور مہیش داس صاحب جنکا ذکر پون ٹوٹی کی ابتدائی خدمت میں آیا بعد میں بہت نامور ہوئے۔ مہیش داس کے نام سے ایک محلہ آباد ہے۔ لالہ سالگ رام وچھنا مل کی اولاد نیل کے کٹرہ میں

بڑے کرّوفر سے رہتی ہے اور دہلی کے اعظم رئیسوں میں اس کا شمار ہے۔
اسکے افراد کی گورنمنٹ میں بڑی عزت ہے۔ خطابات ہیں۔ لاکھوں روپے
سال کی آمدنی ہے بہت صاف ستھرے، گورے چٹے اور قدامت
کی شان سے یہ لوگ ہیں۔

تصوف اور نجوم آرائش مضامین شعر کے واسطے کچھ تصوف کچھ نجوم لگا رکھا ہے۔ ورنہ سوائے موزونی طبع کے یہاں اور کیا رکھا ہے
بہرحال علم نجوم کے قاعدہ کے موافق جب زمانہ کے مزاج میں فساد کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں تب سطح فلک پر یہ شکلیں دکھائی دیتی ہیں جس برج میں یہ نظر آئے اس کا درجہ ودقیقہ دیکھتے ہیں۔ ہزار طرح کی چال ڈالتے ہیں۔ تب ایک حکم نکالتی ہیں شاہجہاں آباد میں بعد غروب آفتاب افق غربی شہر پر نظر آتا تھا۔ اور ان دنوں میں آفتاب اوّل میزان میں تھا۔ تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ صورت عقرب میں ہے۔ درجہ ودقیقہ کی حقیقت نامعلوم رہی۔ بہت دن شہر میں اس ستارہ کی دھوم رہی۔ اب وہ دس بارہ دن سے نظر نہیں آتا۔ بس میں اتنا جانتا ہوں کہ یہ صورتیں قہر الہٰی کی ہیں۔ اور دلیلیں ملک کی تباہی کی۔ قران النحسین پھر کسوف۔ پھر خسوف پھر یہ صورت پر کدورت۔
عیاذاً باللہ وپناہ بخدا۔ یہاں پہلی نومبر کو بدھ کے دن حسب الحکم حکام کوچہ و بازار میں روشنی ہوئی۔ اور شب کو کمپنی کا ٹھیکہ ٹوٹ جانا اور قلمرو ہند کا بادشاہی عمل میں آنا سنایا گیا۔

نواب گورنر جنرل لارڈ کیننگ بہادر کو ملکہ معظمہ انگلستان نے فرزند ارجمند خطاب دیا۔ اور اپنی طرف سے نائب اور ہندوستان کا حاکم کیا۔ میں قصیدہ پہلے ہی اس تہنیت میں لکھ چکا ہوں۔

میں نے گیارھویں مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک روداد غدر نثر میں بعبارت فارسی ناآمیختہ بعربی لکھی ہے اور وہ پندرہ سطرے مسطر سے چار جزو کی کتاب آگرہ کو مفید الخلائق میں چھپنے کو گئی ہے دستنبو اس کا نام رکھا ہے اور اس میں صرف اپنی سرگزشت اور اپنے مشاہدہ کے بیان سے کام رکھا ہے

دلی پر پانچ لشکروں کا حملہ

پانچ لشکر کا حملہ پے درپے اس شہر میں ہوا پہلا باغیوں کا لشکر اس میں اہلِ شہر کا اعتبار لٹا۔ دوسرا لشکر خاکیوں کا۔ اسمیں جان و مال و ناموس و مکان و مکین، آسمان و زمین و آثار ہستی سراسر لٹ گئے تیسرا لشکر کال کا۔ اس میں ہزارہا آدمی بھوکے مرے چوتھا لشکر ہیضہ کا اسمیں بہت سے پیٹ بھرے مرے۔ پانچواں لشکر تپ کا اسمیں تاب و طاقت نہ پائی اب تک اس لشکر نے شہر سے کوچ نہیں کیا۔ میرے گھر دو آدمی تپ میں مبتلا ہیں ایک بڑا لڑکا۔ ایک داروغہ۔ خدا ان دونوں کو جلد صحت دے۔

مغل خاں غدر سے کچھ دن پہلے مستقی ہو کر مر گئے۔ ہے ہے کیونکر لکھوں حکیم رضی الدین خاں کو قتل عام میں ایک خاکی نے گولی ماردی۔ اور احمد حسین خان ان کے چھوٹے بھائی اسی دن مارے گئے۔ طالع یار خاں کے دونوں بیٹے ٹونک سے رخصت لیکر آئے تھے۔ غدر کے سبب جا نہ سکے یہیں رہے۔ بعد فتح دہلی دونوں بے گناہوں کو پھانسی ملی۔ طالع یار خان ٹونک میں ہیں۔ زندہ ہیں پر یقین ہے مردہ سے بدتر ہوں گے۔ میر چھوٹم نے بھی پھانسی پائی۔ حال صاحبزادہ میاں نظام الدین کا یہ ہے کہ جہاں سب اکابر شہر کے بھاگے تھے وہاں وہ بھی بھاگ گئے تھے۔ بڑودہ میں رہے۔ اورنگ آباد میں رہے حیدرآباد میں رہے۔ سال گزشتہ یعنی جاڑوں میں یہاں آئے۔ سرکار سے ان کی صفائی ہو گئی لیکن صرف جان بخشی۔ روشن الدولہ کا مدرسہ جو عقب کوتوالی چبوترہ ہے وہ اور خواجہ قاسم کی حویلی جسمیں

مغل علی خاں مرحوم رہتے تھے وہ اور خواجہ صاحب کی حویلی یہ املاک خاص حضرت
کالے صاحب کی اور کالے صاحب کے بعد میاں نظام الدین کی قرار پا کر ضبط ہوئی
اور نیلام ہو کر روپیہ سرکار میں داخل ہو گیا۔ ہاں قاسم جان کی حویلی جسکے کاغذ میاں
نظام الدین کی والدہ کے نام کے ہیں وہ ان کو یعنی میاں نظام الدین کی والدہ
کو مل گئی۔ فی الحال میاں نظام الدین پاک پٹن گئے۔ شاید بھاول پور بھی جائیں گے

غدر کے بعد جب انگریز پنجاب سے فوج لیکر دہلی پر چڑھے تو انکی فوج کی
وردی خاکی تھی۔ اس واسطے شہر میں خاکی کا لفظ ایک اصطلاح بن گیا
تھا۔ خاکی کا ذکر درحقیقت انگریز کا ذکر سمجھا جاتا تھا۔

میاں نظام الدین صاحب میاں کالے صاحب کے فرزند تھے انکی
جائداد اورنگ آباد دکن میں بھی ہے۔ میاں سیف الدین وغیرہ اس پر قابض
ہیں۔ چالیس ہزار سالانہ کی آمدنی ہے۔ میاں عبدالصمد صاحب دہلوی سے جو
میاں نظام الدین صاحب کے نواسہ ہیں اس جاگیر کا دعوی کیا ہے اور آجکل
حیدرآباد میں اس کا مقدمہ چل رہا ہے۔

غدر نہیں خدا کا قہر

غلہ کی گرانی۔ آفت آسمانی۔ امراض وسوی بلائے جانی
انواع واقسام کے اورام وبثور شائع چارہ ناسود مند
وسعی ضائع۔ میں نہیں جانتا کہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو پہر دن چڑھے وہ فوج باغی میرٹھ سے
دلی آئی تھی یا خود قہر الٰہی کا پے درپے نزول ہوا تھا۔ بقدر خصوصیت سابق دلی
ممتاز ہے ورنہ سرتاسر قلمرو ہند میں فتنہ وبلا کا دروازہ باز ہے۔ انا اللہ۔

لوٹ کی کتابیں کھتریوں میں

کتاب کوئی سی ہو اس کا پتہ کیونکر لگے۔

لوٹ کا مال کھتریوں میں بک گیا۔ اور اگر سڑک پر بکا تو میں کہاں جو دیکھوں؎

بردل نفس اندوہ گیتی بسر آرید   گیر بدہ کہ گیتی ہمہ یکسر بسر آمد

یہاں کا قصہ مختصر یہ ہے کہ قصہ تمام ہوا۔

غدر کے بعد ایک چھوٹا سا فساد

دلی کا حال تو یہ ہے؎

گھر میں تھا کیا جو ترا غم اسے غارت کرتا   وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر سو ہے

یہاں وھرا کیا ہے جو کوئی لوٹے گا۔ چند روز گوروں نے اہل بازار کو ستایا تھا اہل قلم اور اہل فوج نے باتفاق رائے ہمدگر ایسا بندوبست کیا کہ وہ فساد مٹ گیا۔ اب امن وامان ہے۔

میاں کالے صاحب کی خانہ ویرانیاں

حضرت شیخ کا کلام اور صاحبزادہ شاہ قطب الدین

ابن مولانا فخر الدین کا بھلا حال؟ ایں دفتر را گاؤ خورد و گاؤ را قصاب برد و قصاب در راہ مُرد۔ بادشاہ کے دم تک یہ باتیں تھیں۔ خود میاں کالے صاحب کا گھر اس طرح تباہ ہوا کہ جیسے جھاڑو دی۔ کاغذ کا پرزا سونے کا تار پشمینہ کا بال باقی نہ رہا۔ شیخ کلیم اللہ جہان آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا مقبرہ اُجڑ گیا۔ کیا ایک اچھے گانوں کی آبادی تھی ان کی اولاد کے لوگ تمام اس موضع میں سکونت پذیر تھے۔ اب ایک جنگل ہے اور میدان میں قبر۔ اسکے سوا کچھ نہیں وہاں کے رہنے والے اگر گولی سے بچے ہونگے تو خدا ہی جانتا ہوگا کہ کہاں ہیں۔ ان کے پاس شیخ کا کلام بھی تھا۔ کچھ تبرکات بھی تھے اب جب یہ لوگ ہی نہیں تو کس سے پوچھوں کیا کروں کہیں سے یہ مدعا حاصل نہ ہو سکیگا۔

حضرت شیخ کلیم اللہ جہان آبادی کا مزار پریڈ کے میدان میں جامع مسجد کے شرق کی طرف دو سو قدم کے فاصلہ پر میدان میں واقع ہے۔ پہلے

چونہ کا چبوترہ تھا اب سید عبدالغنی کلیمی سجادہ نشین کی سعی سے سنگ مرمر کی سلیں فرش میں لگائی گئی ہیں۔ یہ علاقہ اب تک فوجی قبضہ میں ہے اور یہاں سایہ کی جگہ بنانے کا حکم نہیں ہے۔ نمازی اور زائر نماز و زیارت کے وقت دھوپ کی تکلیف اٹھاتے ہیں۔ پہلے یہاں بڑی بڑی عمارتیں تھیں۔ حضرت شیخ کلیم اللہ سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے بڑے نامور، اور صاحب تصنیف بزرگ گزرے ہیں۔ تفسیر کلیمی۔ مرقع۔ کشکولِ کلیمی۔ عشرۂ کاملہ۔ ما لا بد فی التصوف، مکتوبات کلیمی وغیرہ ان کی یادگار کتابیں ہیں۔ حضرت شیخ یحییٰ مدنی چشتی کے خلیفہ تھے، اور حضرت نظام الدین اورنگ آبادی انہی کے خلیفہ اورنگ آباد میں مدفون ہیں

میاں کالے صاحب کا نام میاں نصیرالدین تھا جو میاں قطب الدین صاحب کے بیٹے اور حضرت مولانا فخرالدین صاحب کے پوتے تھے۔ بہادر شاہ ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ کیونکہ ان کے والد کے مرید اور داد اکے منظور نظر تھے۔ ملکہ بیگم ایک شہزادی سے انہوں نے نکاح بھی کیا تھا۔ قاسم جان کی گلی میں حکیم اجمل خاں صاحب کے محلہ سے غرب کی طرف کالے صاحب کی حویلی مشہور ہے جس میں آجکل پنجابی تاجر دہلی کے رہتے ہیں۔ یہ انہی کی تھی۔ اور غدر میں ضبط ہوئی۔ کوتوالی اور سنہری مسجد کے قریب بھی ان کی جائداد کا ذکر غالب نے کیا ہے۔ اب ان کے نواسہ میاں عبدالصمد صاحب پنڈت کے کوچہ میں رہتے ہیں اور دہلی کے فقرا میں مشہور درویش ہیں۔

دہلی کے مفتی اعظم کی بیچارگی

جناب مولوی صدرالدین صاحب بہت

دن حوالات میں رہے۔ کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا۔ روبکاریاں ہوئیں۔ آخر صاحبان کورٹ نے جان بخشی کا حکم دیا۔ نوکری موقوف۔ جائداد ضبط۔ ناچار خستہ و تباہ لاہور گئے فنانشل کمشنر اور لفٹنٹ گورنر نے ازراہ ترحم نصف جائداد واگزاشت کی۔ اب نصف جائداد پر قابض ہیں۔ اپنی حویلی میں رہتے ہیں۔ کرایہ پر معاش کا مدار ہے۔ اگرچہ یہ امداد ان کے گزارے کو کافی ہے کس واسطے کہ ایک آپ اور ایک بی بی تیس چالیس روپیہ کی آمد۔ لیکن چونکہ امام بخش چپراسی کی اولاد ان کی عترت ہے اور وہ دس بارہ آدمی ہیں۔ لہذا فراغ بالی سے نہیں گزرتی۔ ضعفِ پیری نے بہت گھیر لیا ہے۔ عشرۂ ثامنہ کے اواخر میں ہیں خدا سلامت رکھے بہت غنیمت ہیں ◆

مفتی صدرالدین صاحب صدرالصدور دہلی کے اکابر علما و شرفا میں تھے۔ حویلی صدرالصدور کا تختہ اب بھی میونسپل کمیٹی کی طرف سے لکھا ہوا ایک دیوار پر نظر آتا ہے۔ اور جاننے والے کو رلاتا ہے پٹیا محل کے سامنے ان کا مکان تھا جس میں خان بہادر غلام محمد حسن خاں رجسٹرار مرحوم کی سکونت تھی اور اب ان کی اولاد رہتی ہے

اللہ اللہ مسلمانوں کی غربا پروری کس شان کی تھی کہ مٹنے اور مٹائے جانے کے بعد بھی جبکہ نوّے برس کے قریب عمر تھی اور صرف چالیس روپے مہینہ گزر اوقات کے لئے باقی بچا تھا۔ مگر اپنے چپراسی کے کنبہ کو پالتے تھے۔

گردش ایام کا قیدی لفافہ بناتا تھا	اللہ اللہ! یہ دن بھی یاد رہیں گے

مجھکو اکثر اوقات لفافے بنانے میں گزرتے ہیں۔ اگر خط نہ لکھوں گا تو لفافے بناؤں گا۔ غنیمت ہے کہ محصول آدھ آنہ ہے ورنہ مزہ معلوم ہوتا۔

بقیتہ السیف کا فکر

بعد قتل ہونے دس آدمی کے کہ دو اس میں عزیز بھی تھے۔ یہ سب وہاں سے نکالے گئے۔ مگر صورت نہیں معلوم کہ کیونکہ نکلے پیادہ یا سوار تھے۔ تنگدست یا مالدار مستورات کو تو رتھیں دیدی تھیں۔ ذکور کا حال کیا ہوا۔ اور پھر وہاں سے نکلنے کے بعد کیا ہوا اور کہاں رہے۔ سرکارِ انگریزی کی طرف سے موردِ تفقد و ترحم ہیں یا نہیں۔ رنگ کیا نظر آتا ہے جبر کسر کی توقع ہے یا نہیں۔ یہ سب اللہ کو معلوم ہے +

اب کوئی دوست میرے سامنے نہ مرے

یا اللہ اب ان احباب میں سے کوئی میرے سامنے نہ مرے۔ کیا معنی کہ جو میں مروں کوئی میرا یاد کرنے والا۔ اور مجھ پر رونے والا بھی تو دنیا میں ہو۔ مصطفیٰ خاں خدا کرے مرافعہ میں چھوٹ جائے ورنہ حبسِ ہفت سالہ کی تاب اس ناز پروردہ میں کہاں۔ احمد حسین میکش مخنوق ہوا پھانسی پائی، گویا اس نام کا آدمی شہر میں تھا ہی نہیں۔ پنشن کی درخواست دے رکھی ہے بشرط اجرا بھی میرا کیا گزارہ ہوگا ہاں دو باتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ میری صفائی اور بے گناہی کی دلیل ہے۔ دوسرے یہ کہ موافق قولِ عوام چولہے دلدر نہ ہوگا

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ بے نظیر شاعر اور خاندانی امیر تھے۔ نواب محمد اسحٰق خان مرحوم سابق سکرٹری علی گڑھ کالج ان کے صاحبزادہ تھے جنہوں نے ان کے کلام کا مجموعہ چھاپا ہے اور جو حلقہ مشائخ دہلی میں بکتا ہے اس مجموعہ میں غدر کے حالات بھی ہیں اور رہائی کا تذکرہ بھی ہے۔

نواب مصطفیٰ خان اور ان کے لڑکے نواب محمد اسحٰق خان اپنے خاندان سمیت درگاہِ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رح میں دفن ہیں درگاہ کی بڑی مسجد کے گوشہ شمال اور سماع خانہ کے غرب میں یہ قبرستان واقع ہے۔ سب کتبے لگے ہوئے ہیں۔

جب شراب پر پہرہ لگا

یہاں کا حال۔ ع زمین سخت ہے آسماں دور ہے' جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ تونگر غرور سے مفلس سردی سے اکڑ رہا ہے۔ آبکاری کے بندوبستِ جدید نے مارا۔ عرق کے نہ کھنچنے کی قیدِ شدید نے مارا۔ ادھر انسدادِ دروازہ آبکاری ہے۔ اُدھر ولایتی عرق کی قیمت بھاری ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولوی فضل رسول صاحب حیدرآباد گئے ہیں۔ مولوی غلام امام شہید آگے سے وہاں ہیں۔ محی الدولہ محمد یار خاں سورتی نے ان صورتوں کو وہاں بلایا ہے۔ پر یہ نہ معلوم کہ وہاں ان کو کیا پیش آیا ہے۔

دوستوں سے ملنے میں دشواری تھی

حکیم صاحب پر سے وہ سپاہی جوان پر متعین تھا، اٹھ گیا۔ اور ان کو حکم ہو گیا کہ اپنی وضع پر رہو۔ مگر شہر میں رہو باہر جانے کا اگر قصد کرو تو پوچھ کر جاؤ۔ اور ہر ہفتہ میں ایک بار کچہری میں حاضر ہوا کرو۔ چنانچہ وہ کچے باغ کے پچھواڑے مرزا جاگن کے مکان میں آ رہے ہے۔ صفدر میرے پاس آیا تھا یہ اس کی زبانی ہے جی ان کے دیکھنے کو چاہتا ہے مگر از راہ احتیاط جا نہیں سکتا۔ مرزا بہادر بیگ نے بھی رہائی پائی۔ اب اس وقت سنا ہے کہ وہ خانصاحب کے پاس آئے ہیں یقین ہے کہ بعد ملاقات باہر چلے جائیں گے۔ یہاں نہ رہیں گے۔

مٹنے والوں کے گھروں میں کون رہتا تھا

قاسم جان کی گلی میر خیراتی کے پھاٹک سے فتح اللہ بیگ خاں کے پھاٹک تک بے چراغ ہے۔ ہاں اگر آباد ہے تو یہ ہے کہ غلام حسن خاں کی حویلی ہسپتال ہے

ور ضیاءالدین خاں کے کمرہ میں ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں اور کالے صاحب کے مکانوں میں ایک اور صاحب
عالیشان انگلستان تشریف رکھتے ہیں ضیاءالدین خاں اور انکے بھائی مع قبائل اور عشائر لوہارو میں
لال کنوئیں کے محلہ میں خاک اڑتی ہے آدمی کا نام نہیں ہے کبھی کی دکان ہیں کتے لوٹتے ہیں۔

مجھے عوام کے نقشہ میں نہ لکھ | ۵

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے — کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

میرٹھ سے آکر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے۔ اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ لاہوری دروازہ کا تھانہ دار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے جو باہر کے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں پانچ پانچ بید لگتے ہیں۔ یا دو دو روپیہ جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔ اس سے علاوہ سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا جمعدار میرے پاس بھی آیا۔ میں نے کہا بھائی! تو مجھے نقشے میں نہ رکھ۔ میری کیفیت کی عبارت الگ لکھ۔ عبارت یہ کہ اسد اللہ خاں پنشن دار ۱۸۵۰ء سے حکیم پٹیالے والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے۔ نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا اور نہ گوروں کے زمانے میں نکلا۔ اور نکالا گیا۔ کرنیل برون صاحب بہادر کے زبانی حکم پر اس کی اقامت کا مدار ہے۔ اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا۔ اب حاکم وقت کو اختیار ہے۔ پرسوں یہ عبارت جمعدار نے نقشہ کے ساتھ کوتوالی میں بھیجدی ہے۔ کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان دوکان کیوں بناتے ہیں۔ جو مکان بن چکے ہیں انہیں ڈھا دو اور آیندہ کو ممانعت کا حکم سنا دو اور یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے بقدر مقدور نذرانہ دے۔ اس کا اندازہ مقرر کرنا حاکم کی رائے پر ہے۔ روپیہ دے

اور ٹکٹ لے۔ گھر برباد ہو جائے۔ آپ شہر میں آباد ہو جائیے آج تک یہ صورت ہے۔ دیکھئے شہر کے بسنے کی کون مہورت ہے جو رہتے ہیں وہ بھی اخراج کیئے جاتے ہیں۔ یا جو باہر پڑے ہوئے ہیں وہ شہر میں آتے ہیں الملک للہ والحکم للہ +

کیسی بیکسی ہیں وہ لوگ تھے جنہوں نے غدر کے بعد کام یہ دم گھوٹنے والا تماشہ دیکھا۔ اور کیسے نادان ہم لوگ ہیں کہ پھر بے امنی کی تمنائیں کرتے ہیں۔ انسان متلون مزاج اور جلدی بھول جانے والا واقع ہوا ہے۔ امن کی برابر دنیا میں کوئی چیز اچھی نہیں ہے۔

سوسائٹی کی بربادی کا ماتم

اس چرخ کجرفتار کا برا ہو۔ ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ ملک و مال۔ جاہ جلال کچھ نہیں رکھتے تھے۔ ایک گوشہ و توشہ تھا۔ چند مفلس و بے نوا ایک جگہ فراہم ہو کر کچھ ہنس بول لیتے تھے سو

اور تو یہاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا
سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک

یہ شعر خواجہ میر درد کا ہے۔ کل سے مجھ کو میکش بہت یاد آتا ہے۔ وہ صحبتیں اور تقریریں۔ آنسوؤں سے پیاس نہیں بجھتی۔ یہ تحریر تلافی اس تقریر کا نہیں کر سکتی۔

میکش کے پھانسی پانے کے بعد عالم غم والم میں یہ تحریر لکھی گئی ہے ہائے کتنا درد حروف کے کلیجہ میں بھرا ہے۔ پڑھکر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

دہلی سے انتہائی محبت اسکے اجڑنیکی خاک بھی آنکھوں میں

آنکھوں کے غبار کی وجہ یہ ہے کہ جو مکان دہلی میں ڈھائے گئے اور جہاں جہاں سڑکیں نکلیں جتنی گرد اڑی اس سب کو از راہ محبت اپنی آنکھوں میں جگہ دی۔

دہلی سے محبت کرنے کی یہ انتہائی مثال غالب نے لکھی ہے۔ کہ آنکھیں دکھنے آئیں تو اس کا سبب یہ قرار دیا کہ دہلی کے مکان اجاڑے گئے اور اسکے مٹنے سے خاک اڑی تو اس کو آنکھوں میں بٹھا لیا۔ گو اسکے اثر سے آنکھیں دکھنے لگیں۔

اپنے وطن سے محبت اس طرح کیا کرتے ہیں۔ کوئی آجکل کے محبان وطن کو غالب کے یہ چند لفظ سنا دے۔

غالب کو کنووں کا غم

اب اہل دہلی ہندو ہیں یا اہل حرفہ ہیں۔ یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں۔ یا گورے ہیں۔ لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا۔ سیاست تو جاتی رہی باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں خس کی ٹٹی، پروا ہوا۔ اب کہاں؟ لطف تو وہ اسی مکان میں تھا۔ اب میر خیراتی کی حویلی میں وہ چھت اور سمت بدلی ہوئی ہے بہر حال میگزرد مصیبت عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں بند ہوگیا۔ لال ڈگی کے کنوئیں یک قلم کھاری ہوگئے۔ خیر کھاری ہی پانی پیتے۔ گرم پانی نکلتا ہے پرسوں میں سوار ہوکر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا مسجد جامع سے راجگھاٹ دروازہ تک بے مبالغہ ایک صحرا لق ودق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو ہوا کا مکان ہوجاتے۔ مرزا گوہر کے باغیچہ کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا۔ اب وہ باغیچہ کے صحن کے برابر ہوگیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند

ہوگیا فصیل کے کنگورے کھلے رہتے ہیں۔ باقی سب اُٹ گیا۔ آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازہ سے کابلی دروازہ تک میدان ہوگیا۔ پنجابی کٹرہ دھوبی واڑہ۔ رامجی گنج سعادت خاں کا کٹرہ جرنیل کی بی بی کی حویلی رام جی داس گودام والی کے مکانات صاحب رام کا باغ۔ حویلی ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہوگیا تھا اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہوگیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہوجائے گا۔ اللہ اللہ دلی والے ابتک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں واہ رے حسن اعتقاد اردو بازار نہ رہا اردو کہاں۔ دلی کہاں۔ واللہ اب شہر نہیں ہے کیمپ ہے۔ چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ نہ شہر۔ نہ بازار۔ نہ نہر +

اس عبارت میں غالب نے دہلی کی اُن شاندار عمارات کی بربادی کا نقشہ کھینچا ہے جن میں سے اکثر کے نام سے بھی اب دہلی والے واقف نہیں۔ اور میں بھی نہیں بتا سکتا کہ وہ کہاں تھیں۔

معلوم ہوتا ہے غالب کو سب سے زیادہ کنون کے بند کر دینے کا صدمہ ہے۔ وہ یہ سُنکر کہ کنوئیں بند کئے جا رہے ہیں خود گھر سے نکلے تاکہ اپنی آنکھ سے دیکھیں۔ حالانکہ ان کا گھر سے نکلنا آجکل کی طرح کوئی معمولی بات نہ تھی۔ مشرق والے خصوصاً ہندوستان اور دہلی والے کنوں کے پانی کو بہت پسند کرتے ہیں اور انکو نلوں کے پانی سے کسی قسم کی محبت نہیں ہے۔ حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم بھی ایک جگہ لکھتے ہیں۔

حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا — پانی پینا پڑا ہے پائپ کا۔

پیٹ چلتا ہے۔ آنکھ آئی ہے — شاہ ایڈورڈ کی دُہائی ہے

انگریزوں نے حفظِ صحت کے خیال سے کنوئیں بند کئے تھے کہ ان کا

پانی جلد خراب ہو جاتا ہے۔ مگر اہل مشرق اپنی پرانی عادات کے خلاف کسی مصلحت کو قبول کرنا نہیں چاہتے۔

تحریر کے شروع میں غالب نے دہلی کی آبادی کے بارہ میں سچ لکھا ہے کہ غدر کے بعد ایسی جماعتیں وہاں آکر آباد ہو گئی تھیں جنکو زبان اور تہذیب و علم سے کچھ سروکار نہ تھا۔ اس لئے آجکل دہلی کی بگڑی ہوئی زبان پر اعتراض کرنا بھی فضول ہے کہ یہ زبان اہل دہلی کی نہیں ہے وہ تو پھانسی پا گئے اور جو لوگ یہ زبان بولتے ہیں وہ دہلی والے نہیں ہیں پردیسی ہیں ٭

دہلی کی بہاروں کا فشار اور غالب کی آہِ شرربار

دہلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ۔ چاندنی چوک۔ ہر روز مجمع بازار مسجد جامع کا ہر ہفتہ سیر جمنا کے پل کی ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلی کہاں۔ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔ نواب گورنر جنرل بہادر ۱۵ دسمبر کو یہاں داخل ہوں گے۔ دیکھئے کہاں اترتے ہیں اور کیونکر دربار کرتے ہیں آگے کے درباروں میں سات جاگیردار تھے کہ ان کا الگ الگ دربار ہوتا تھا جھجر بہادر گڈھ۔ بلب گڈھ۔ فرخ نگر۔ دوجانہ۔ پاٹودی۔ لوہارو۔ چار معدوم محض ہیں جو باقی رہے اسمیں سے دوجانہ دلوہارو تحت حکومت ہانسی حصار پاٹودی حاضر۔ اگر ہانسی حصار کے صاحب کمشنر بہادران دونوں کو یہاں لے آئے تو تین رئیس ورنہ ایک رئیس۔ دربار عام والے مہاجن لوگ سب موجود۔ اہل اسلام میں سے صرف تین آدمی باقی ہیں میرٹھ میں میاں مصطفےٰ خاں سلطان جی میں مولوی صدر الدین خاں۔ بلی ماروں میں سگِ دنیا موسوم اسد تینوں مردود و مطرود و محروم و مغموم

ٹوٹ بیٹھے جبکہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا آسمان سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

جان نثار خاں کے چھتے کا ڈھنا۔ خان چند کے کوچہ کا مٹرک بننا۔ بلاقی بیگم کے کوچہ کا مسمار ہونا۔ جامع مسجد کے گرد ستر بہتر گز میدان نکلنا۔ اور غالب افسردہ دل۔

—————— ✻ ——————

دہلی کی پانچ بہادروں کا کس او روے ذکر کرتے ہیں۔ چاندنی چوک کی وہ رونق جاتی رہی۔ قلعہ میں گورے آباد ہو گئے جمنا کے پل کی سیر کا اب کسی کو خیال بھی نہیں آتا۔ پہلے وہاں آٹھویں دن میلہ لگتا تھا۔ جامع مسجد کے سامنے شام کو اب بھی بازار لگتا ہے۔ مگر پہلی سی بہار نہیں پھول والوں کی سیر اب بھی سال بسال ہوتی ہے لیکن اگلی سی آن بان کہاں۔

جھجر والے نواب اور بلب گڈھ کے راجہ نے غدر کے بعد دہلی میں پھانسی پائی جھجر ضلع رہتک میں شامل ہوا۔ اور بہادر گڈھ بھی اور بلب گڈھ ضلع گڑگانوہ کو دیدیا گیا۔

یہ عبارت غالباً ۱۸۵۹ء کے آخر میں لکھی گئی ہے۔ کیونکہ گورنر نے میرٹھ میں دربار دسمبر ۱۸۵۹ء میں کیا تھا جس کا ذکر غالب نے کیا ہے۔

آخر کی عبارت اس قدر دردناک ہے کہ پتھر کا کلیجہ رکھنے والا بھی بے اختیار رو دیگا خبر نہیں غالب کے دل پر کیا کیا اثر یہ انقلابات پیدا کرتے ہونگے جب ہی تو ان کے قلم سے یہ مجروح کرنے والے الفاظ نکلے

—————— ✻ ——————

برٹش طرز حکومت پر چوٹ

سنتے ہیں کہ نومبر میں مہاراجہ کو اختیار ملیگا مگر وہ اختیار ایسا ہوگا۔ جیسا خدا نے خلق کو دیا ہے۔ سب کچھ اپنے قبضۂ قدرت میں رکھا۔ آدمی کو بدنام کیا ہے۔

یہاں مہاراجہ الور کے اختیار کا ذکر کرتے ہیں۔ مگر برطانی آئین سلطنت پر ایک پرلطف ضرب بھی لگاتے ہیں۔ کہ وہ والیان ریاست کو ایسا اختیار دیتا ہے جیسا خدا نے بندوں کو اختیار دیا ہے۔ کہ مجبور بھی ہیں اور مختار بھی غالب نے اُس وقت یہ عبارت لکھی کہ مشرقی آئین سلطنت لوگوں کے دل و دماغ پر مسلط تھے اور خلقت انہی کو اچھا سمجھتی تھی۔ آج وہ زندہ ہوتے تو مان جاتے کہ پرانا دستور امن کے لئے اتنا مفید نہ تھا جتنا نیا آئین ثابت ہوا۔ والیان ریاست کو مطلق العنان کر دینے کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وہ ہمیشہ بغاوتیں کرتے رہتے تھے۔ اور سلطنت کو بھی دشواریاں پیش آتی تھیں اور رعایا بھی تباہ ہوئی تھی۔ انگریزوں کے آئین جدید نے اس خرابی کا قطعی سدباب کر دیا۔ اور اب غدر ۵۷ء کے بعد سے کسی ریاست کو سرکشی و بغاوت کا حوصلہ نہ ہو سکا اور ملک میں امن قایم ہو گیا اس واسطے ہر شخص برٹش آئین کے اس عاقلانہ حصہ کو امن کے خیال سے پسند کرتا ہے اور یہ برائی کی چیز نہیں سمجھی جاتی۔

تاج محل کی رہائی

چوک میں بیگم کے باغ کے دروازہ کے سامنے حوض کے پاس جو کنواں تھا اس میں سنگ وخشت و خاک ڈال کر بند کر دیا بلیماروں کے دروازہ کے پاس کئی دوکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کر لیا شہر کی آبادی کا حکم خاص و عام کچھ نہیں ہے پنشن داروں سے حاکموں کا کام کچھ نہیں۔ تاج محل۔ مرزا قیصر۔ مرزا جوان بخت کے سالے

ولایتعلی بیگ اور جیپور کی زوجہ ان سب کی الہ آباد سے رہائی ہو گئی۔ دیکھئے کیمپ میں رہیں یا لندن جائیں۔ خلق نے از روئے قیاس جیسا کہ دلی کے خبر تراشوں کا دستور ہے یہ بات اڑا دی ہے۔ سو سارے شہر میں مشہور ہے کہ جنوری شروع سال ۱۸۵۹ء میں عموماً شہر میں آباد کئے جاویں گے۔

یہ عبارت ۱۲ ردسمبر ۱۸۵۸ء کی لکھی ہوئی ہے۔ تاج محل بہادر شاہ کی بیگم تھیں۔ زینت محل کا کمرہ لال کنوئیں اور فراش خانہ کے وسط میں سیر بازار واقع ہے۔ اسکے شاندار دروازہ پر بہادر شاہ کی کہی ہوئی اور خاص ان کی ہاتھ کی لکھی ہوئی تاریخ کندہ ہے۔ یہ عالیشان عمارت آجکل مہاراجہ پٹیالہ کے قبضہ میں ہے۔ غدر کے ایام میں جو امداد انہوں نے انگریزی فوج کی کی تھی اس کے انعام میں یہ مکان ان کو دیا گیا تھا۔

تاج محل کا خوبصورت مکان کٹرہ خوش حال رائے میں تھا کہ جو ہندوؤں کے مشہور محلہ مالی واڑہ کے قریب واقع ہے۔ یہ مکان اب بھی موجود ہے اور اس میں دہلی کے مشہور ساہوکار لالہ رام کشن داس رہتے ہیں جن کے ہاں چاندی سونے کا بیوپار ہوتا ہے۔ لالہ صاحب نے اس کی قدامت کی خوبصورتی کو بھی باقی رکھا ہے اور جدید خوشنما اضافے بھی کئے ہیں۔ مگر زینت محل کے کمرہ میں ریاست پٹیالہ نے کوئی ترقی نہیں کی بلکہ سابق کے آثار میں بھی بوسیدگی واقع ہو رہی ہے اور یہ تاریخی مکان چند دن کا مہمان ہے۔

جامع مسجد کی رہائی

مسجد جامع واگزاشت ہوئی چیتلی قبر کی طرف سیڑھیوں پر کبابیوں نے دو دکانیں بنالیں۔ انڈا مرغی، کبوتر بکنے لگا۔ دس آدمی مہتمم ٹھہرے مرزا الٰہی بخش۔ مولوی صدرالدین۔ تفضل حسین خان یہیں یہ۔ سات اور۔ ۷ نومبر۔ ۱۴ ارجمادی الاوّل سال حال جمعہ کے دن ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ و قید جسم سے رہا ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جامع مسجد دہلی کے واگزاشت کرانے میں خان بہادر شیخ الٰہی بخش صاحب سی آئی ای مرحوم رئیس میرٹھ نے دو لاکھ روپیہ یا اسی کے قریب سرکار کو دیا تھا جب ان کو رہا کیا گیا تھا۔ فتح دہلی کے بعد جامع مسجد میں گورے سپاہی رہتے تھے۔

جامع مسجد ایام غدر میں باغیوں کا مرکز سمجھی گئی تھی جب انگریزی فوج نے پہلا دھاوا شہر پر کیا تو وہ جامع مسجد تک آگئی تھی۔ مگر جمعہ کی نماز کے لئے جو مسلمان اس وقت وہاں جمع ہوئے تھے انہوں نے باہر نکل کر فوج سے مقابلہ کیا۔ اور ایسے لڑے کہ فوج کو کشمیری دروازہ تک واپس جانا پڑا اور دوسرے دن دوبارہ حملہ کر کے دہلی فتح کرلی۔ جمعہ کی لڑائی میں میرے والد موجود تھے۔ ان سے میں نے یہ قصہ سنا اور یہی وجہ جامع مسجد کے فوجی قبضہ کی تھی۔

میکش پھانسی سے پہلے

میکش چین میں ہے۔ باتیں بناتا پھرتا ہے سلطانجی میں تھا اب شہر میں آگیا ہے۔ دو تین بار میرے

پاس بھی آیا ۔ پانچ سات دن سے نہیں آیا ۔ کہتا تھا بی کو لڑکے کو بہرام پور میں بیر علی کے پاس بھیج دیا ہے ۔ خود یہاں لوٹ کی کتابیں خریدتا پھرتا ہے ۔

یہ تحریر اس وقت کی ہے جبکہ میکش زندہ تھے ۔ اور غدر کی شرکت کا ان پر الزام نہ لگایا گیا تھا ۔ درگاہ حضرت سلطان جیؒ میں رہتے تھے ۔ مگر بعد میں ان کو بغاوت کے شبہ میں گرفتار کیا گیا ۔ اور پھانسی دی گئی ۔ اسی روزنامچہ میں غالب نے کہیں اس کا ذکر کیا ہے ۔
میکش کے باپ گولی سے قتل ہوئے اور ان کو پھانسی دی گئی ۔

کشمیری کٹرہ کی مسماری

کشمیری کٹرہ گر گیا ہے ، دو اونچے اونچے درے اور دو بڑی بڑی کوٹھریاں دور دو سے نظر نہیں آتیں کہ کیا ہوئیں ۔

پریڈ کے میدان کو دربار ۱۹۱۱ء کے ایام میں جب ہموار کیا جا رہا تھا تو سینکڑوں مکانات کے آثار دبے ہوئے نکلتے تھے ۔ یہاں تک کہ چارپائیوں کے پایہ آٹا گوندھنے کے کونڈے اور گھروں کے برتنے کی چیزیں ملیں ۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب یہاں کے بازار او محلے مسمار کئے گئے تو رہنے والوں کا سامان بھی اس میں دب گیا ۔
خیال یہ تھا کہ گنجان محلوں اور بازاروں کا توڑنا ہوا صاف کرنے کے لئے تھا ۔ مگر ۱۹۱۱ء میں یہ نشانیاں دیکھ کر کہا جاتا تھا کہ مسماری جوش انتقام سے بھی تعلق رکھتی تھی ۔ جب ہی تو اس بے دردی سے خانہ داری کے اسباب کو بھی ملیا میٹ کر دیا گیا ۔ اور یہی وجہ ہے کہ غالب حسب ان

تباہی کا ذکر لکھتے ہیں تو ان کا قلم آنسو بہاتا جاتا ہے۔

جب دہلی پر ٹیکس لگائے گئے

شہر میں "پون ٹوٹی" کوئی چیز ہے وہ جاری ہو گئی ہے۔ سوائے اناج اور اُپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں جس پر محصول نہ لگا ہو۔ جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فیٹ گول میدان نکلے گا۔ دکانیں۔ حویلیاں ڈہائی جاویں گی۔ دارالبقا فنا ہو جائے گی۔ رہے نام اللہ کا۔ خان چند کا کوچہ شاہ بولا کے بڑھ تک ڈھئے گا۔ دونوں طرف پھاوڑہ چل رہا ہے +

پون ٹوٹی (چنگی) کوئی چیز ہے۔ کہکر غالب نے تڑپا دیا۔ طعن کا نہایت پرلطف انداز ہے۔ سوائے اناج اور اپلے کے ہر چیز پر ٹیکس (محصول) لگ جانا غالب جیسے شخص نے یقیناً نہایت حقارت سے محسوس کیا ہوگا چار پانچ فقروں میں نئی حکومت کے طرز حکمرانی کو بیان کر دینا غالب ہی کا کام تھا۔

دہلی کے غارت شدہ بازار

شہر ڈھ رہا ہے۔ بڑے بڑے نامی بازار خاص بازار۔ اردو بازار اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا اب پتہ بھی نہیں کہ کہاں تھے صاحبان امکنہ و دکاکین نہیں بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا اور دکان کہاں تھی۔ برسات بھر مینھ نہیں برسا۔ آب تیشہ اور کلند کی طغیانی سے مکانات گر گئے۔ غلہ گراں ہے۔ موت ارزاں ہے۔ موے کے مول اناج بکتا ہے۔ ماش کی دال آٹھ سیر۔ باجرہ۔ بارہ سیر

گیہوں ۱۳ سیر۔ چنے ۱۶ سیر گھی ۱ ۱/۲ سیر۔

یہ تینوں بازار دریا گنج (فیض بازار) کی سڑک کے خاتمہ سے شروع ہوتے تھے۔ جہاں اب پریڈ باغ۔ ایڈرڈ پارک۔ وکٹوریہ ہسپتال اور پریڈ کا میدان واقع ہے۔

اس وقت کی گرانی جس کا حال لکھکر غالب حیران ہیں آجکل کی گرانی کے مقابلہ میں ارزانی ہے۔ اب ماش کی دال ۳ سیر گندم ۴ سیر باجرہ ۴ سیر اور گھی آدہ سیر ہے۔ یہ نرخ پہلی اشاعت کے وقت کا ہے۔

بہادر شاہ کے سکہ کہنے کا الزام

سکہ کا وار تو مجھ پر ایسا چلا کہ جیسے کوئی چھرا یا کوئی گراب کس سے کہوں۔ کس کو گواہ لاؤں۔ یہ دونوں سکے ایک وقت میں کہے گئے ہیں۔ یعنی جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے تو ذوق نے یہ دونوں سکے کہکر گزرانے بادشاہ نے پسند کئے۔ مولوی محمد باقر[1] جو ذوق کے معتقدین میں تھے۔ انہوں نے اپنے دلی اردو اخبار میں یہ دونوں سکے چھاپے۔ اس سے علاوہ اب وہ لوگ بھی موجود ہیں کہ جنہوں نے اس زمانہ میں مرشد آباد اور کلکتہ میں یہ سکے سُنے ہیں۔ اور ان کو یاد ہیں۔ اب یہ دونوں سکے سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گزرانے ہوئے ثابت ہوتے۔ میں نے ہر چند قلمرو ہند میں دلی اردو اخبار کا پرچہ ڈھونڈھا۔ کہیں ہاتھ نہ آیا۔ یہ دھبہ مجھ پر رہا پنشن بھی گئی۔ اور وہ ریاست کا نام و نشان، خلعت و دربار بھی مٹا۔

[1] مولوی محمد باقر غالبا شمس العلماء مولنا محمد حسین آزاد کے والد یا کوئی عزیز ہونگے۔ انکے اردو اخبار کا ذکر غدر کے اکثر حالات میں آتا ہے۔ (حسن نظامی)

سکہ کی حقیقت لکھنے میں جو سادہ پراثر اور شاعرانہ تلازمہ برتا گیا ہے وہ زبانِ غالب کا بہترین نمونہ ہے ناظرین غور سے دیکھیں۔

داغ دارِ دہلی

رفع فتنہ و فساد اور بلاد میں مُسلّم۔ یہاں کوئی طرح آسایش کی نہیں ہے۔ اہل دہلی عموماً بُرے ٹھہر گئے۔ یہ داغ انکی جبین حال سے عموماً مٹ نہیں سکتا۔

دہلی میں مارشل لا

رہنا شہر میں بے حصولِ اجازت حاکم احتمالِ ضرر رکھتا ہے۔ اگر خبر نہ ہو تو نہ ہو۔ اگر خبر ہو جائے تو البتہ قباحت ہے۔ دلی کی عملداری میرٹھ و آگرہ اور بلادِ شرقیہ کے مثل نہیں ہے۔ یہ پنجاب احاطہ میں شامل ہے۔ نہ قانون نہ آئین جس حاکم کی جو رائے میں ہو وہ ویسا ہی کرے۔

غالب نے مارشل لا کے چہرہ کو جگہ جگہ جس اختصار اور جس احتیاط مگر جس بیباکی سے لکھا ہے وہ آجکل کے سیاست نگاروں کے لئے قابل تقلید ہے۔

امن کے اشتہار کے بعد

حکم عفو تقصیر عام ہو گیا ہے۔ لڑنے والے آتے جاتے ہیں اور آلات حرب و پیکار دیکر توقیع آزادی پاتے ہیں۔

یہ عبارت ۱۰ نومبر ۱۸۵۸ء کو لکھی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب باغیوں کو امن مل گیا تھا۔ مگر اس کے بعد ۱۸۵۹ء اور ۱۸۶۰ء تک غالب کی بعض تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کے اندر مسلمانوں کو بغیر ٹکٹ کے آنے کی اجازت نہ تھی غالباً انتظاماً بعض حکام مقامی نے ایسا

کیا ہوگا۔ ورنہ ملکہ وکٹوریہ امن عام کا اشتہار مے چکی تھیں جو ۱۸۵۸ء میں
شائع ہوگیا تھا۔

(*)

امدادی خرچ چند اشخاص کو اس بائیس مہینے میں سال بھر کا روپیہ بطریق مدد خرچ مل گیا باقی چڑھی ہوئے روپے کے باب میں اور آیندہ ماہ بماہ ملنے کے واسطے ابھی کچھ حکم نہیں ہوا۔ سوال امیر خسروؔ کی انملی ہے "چیل بسولا لے گئی لو کا ہے پھٹکوں راب" علی بخش خاں پچیس روپیے مہینا پاتے تھے۔ بائیس مہینے کے گیارہ سو روپے ہوتے ہیں۔ ان کو چھ سو روپے مل گئے۔ باقی روپیہ چڑھا رہا۔ آیندہ ملنے میں کچھ کلام نہیں۔ غلام حسن خاں سو روپے مہینے کا پنشن دار۔ بائیس مہینے کے بائیس سو روپے ہوتے ہیں۔ اس کو بارہ سو ملے۔ دیوان کشن لال کا ڈیڑھ سو روپے مہینا۔ بائیس مہینے کے تین ہزار تین سو ہوتے ہیں۔ اس کو اٹھارہ سو ملے۔ منا جمعدار دس روپے مہینے کا سکھ لعبر سال بھر کے ایک سو بیس لے آیا اسی طرح پندرہ سولہ آدمیوں کو ملا ہے۔ آیندہ کے واسطے کسی کو کچھ حکم نہیں۔ مجھکو پھر مدد خرچ نہیں ملا جب کئی خط پر خط لکھے تو اخیر خط پر صاحب کمشنر بہادر نے حکم دیا کہ سائل کو بطریق مدد خرچ سو روپے ملجاویں میں نے وہ سو روپے نہ لئے۔ اور پھر صاحب کمشنر بہادر کو لکھا کہ میں باسٹھ روپے آٹھ آنے مہینا پانیوالا ہوں۔ سال بھر کے ساڑھے سات سو روپے ہوتے ہیں سب پنشن داروں کو سال بھر کا روپیہ مجھکو سو روپے کیسے ملتے ہیں۔ مثل اوروں کے مجھے بھی سال بھر کا روپیہ مل جاوے۔ ابھی اس میں کچھ جواب نہیں ملا۔ آبادی کا یہ رنگ ہے کہ ڈھنڈھورا پٹوا کر ٹکٹ چھپوا کر اجرٹن صاحب بہادر بطریق ڈاک کلکتہ چلے گئے۔ دلی کے حمقا جو باہر پڑے ہوئے ہیں منہ کھول کر رہ گئے۔ اب جب وہ

معاودت کرینگے تب شاید آبادی ہوگی۔ یا کوئی اور نئی صورت نکل آئے۔

یہ تحریر فروری ۱۸۵۹ء کی ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸۵۸ء میں اشتہار امن کے بعد بھی حکامِ انتظامی نے دہلی کے آباد ہونے میں احتیاط کی تھی۔

دربار میں غالب تھے اور مہاجن

رگِ قلم کی خونابہ فشانی۔ دیکھو، گورنر اعظم نے میرٹھ میں دربار کا حکم دیا صاحب کمشنر بہادر دہلی نے سات جاگیرداروں میں سے جو تین بقیۃ السیف تھے ان کو حکم دیا اور دربارِ عام میں سے سوائے میرے کوئی نہ تھا۔ یا چند مہاجن مجھکو حکم نہ پہنچا۔ جب میں نے استدعا کی تو جواب ملا کہ اب نہیں ہوسکتا۔ میں اپنی عادت قدیم کے موافق خیمہ گاہ میں پہنچا۔ مولوی اظہار حسین خان صاحب بہادر سے ملا چیف سکریٹر بہادر کو اطلاع کی جواب آیا کہ فرصت نہیں۔ میں سمجھا کہ اس وقت فرصت نہیں، دوسرے دن پھر گیا میری اطلاع کے بعد حکم ہوا کہ ایامِ غدر میں تم باغیوں سے اختلاط رکھتے تھے۔ اب گورنمنٹ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟ اُس دن چلا آیا۔ دوسرے دن میں نے انگریزی خط ان کے نام لکھکر ان کو بھیجا مضمون یہ کہ باغیوں سے میرا اختلاط مظنّہ محض ہے۔ امیدوار ہوں کہ اِس کی تحقیقات ہو تاکہ میری صفائی اور بیگناہی ثابت ہو۔ یہاں کے مقامات پر جواب نہ ہوا۔ اب ماہ گزشتہ یعنی فروری میں پنجاب کے ملک سے جواب آیا کہ لارڈ صاحب بہادر فرماتے ہیں کہ ہم تحقیقات نہ کریں گے۔ پس یہ مقدمہ طے ہوا۔ دربار و خلعت مسدود و پنشن موقوف وجہ نامعلوم۔ لاموجود الا اللہ و لا موثر فی الوجود الا اللہ۔ ۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی خان

یوسف علی خاں بہادر والیئے رامپور کہ میرے آشنائے قدیم ہیں، اس سال ۱۸۵۵ء
میں میرے شاگرد ہوئے۔ ناظم ان کو تخلص دیا گیا بیس پچیس غزلیں اردو کی بھیجے ہیں
صلاح دیکر بھیج دیتا۔ کچھ روپیہ ادھر سے آتا رہتا۔ قلعہ کی تنخواہ جاری انگریزی پنشن
کھلا ہوا۔ ان کے عطایا فتوح گنے جاتے تھے۔ جب یہ دونوں تنخواہیں جاتی رہیں
تو زندگی کا مدار ان کے عطیہ پر رہا۔ بعد فتح دہلی وہ ہمیشہ میرے مقدم کے خواہاں
رہتے تھے میں غدر کرتا تھا جب جنوری ۱۸۶۰ء میں گورنمنٹ سے وہ جواب پایا
کہ اوپر لکھ آیا ہوں تو میں آخر جنوری میں رامپور گیا چھ سات ہفتے وہاں رہکر دلی آیا

غالب کے استقلال نے فتح پائی

۱۸۶۰ء میں لارڈ صاحب بہادر
نے میرٹھ میں دربار کیا۔ صاحب
کمشنر بہادر دہلی کو ساتھ لے گئے۔ میں نے پوچھا کہ میں بھی چلوں۔ فرمایا کہ نہیں۔ جب
لشکر میرٹھ سے دلی میں آیا موافق اپنے دستور کے روز ورود لشکر مخیم میں گیا۔ میر منشی
صاحب سے ملا۔ ان کے خیمہ سے اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سکرٹر بہادر کے پاس
بھیجا۔ جواب آیا کہ تم غدر کے زمانہ میں بادشاہی باغی کی خوشامد کیا کرتے تھے اب
گورنمنٹ کو تم سے ملنا منظور نہیں میں گدا مبرم اس حکم پر ممنوع نہ ہوا جب لارڈ
صاحب بہادر کلکتہ پہنچے۔ میں نے قصیدہ حسب معمولِ قدیم بھیجدیا مع اس
حکم کے واپس آیا کہ آپ یہ چیزیں ہمارے پاس نہ بھیجا کرو۔ میں مایوسِ مطلق
ہوکر بیٹھ رہا۔ اور حکامِ شہر سے ملنا ترک کیا۔ واقع اواخر ماہ گزشتہ یعنی فروری ۱۸۶۳ء
نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب دلی آئے۔ اہالیانِ شہر صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر و
صاحب کمشنر کے پاس دوڑے اور اپنے نام لکھوائے۔ میں تو بیگانہ محض اور مطرود
حکام تھا جگہ سے نہ ہلا کسی سے نہ ملا۔ دربار ہوا ہر ایک کامگار ہوا۔ شنبہ
۸ رفروری کو آزادانہ منشی من پھول سنگھ صاحب کے خیمہ میں چلا گیا۔ اپنے نام کا ٹکٹ

صاحب سکرٹر بہادر پاس بھیجا بلایا گیا۔ مہربان پاکر نواب صاحب کی ملازمت کی استدعا کی۔ وہ بھی حاصل ہوئی۔ وہ حاکم جلیل القدر کی وہ عنایتیں دیکھیں جو میرے تصور میں بھی نہ تھیں۔ بقیہ روداد یہ ہے کہ دوشنبہ دوم مارچ کو سواد شہر مخیم خیام گورنری ہوا۔ آخر روز میں اپنے شفیق قدیم جناب مولوی اظہار حسین خاں بہادر کے پاس گیا۔ اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ تمہارا دربار و خلعت بدستور بحال و برقرار ہے۔ متحیرانہ میں نے پوچھا کہ حضرت کیونکر؟ حضرت نے کہا کہ حاکم حال نے ولایت سے آکر تمہارے علاقہ کے سب کاغذ انگریزی و فارسی دیکھے۔ اور رباجلاس کونسل حکم لکھوایا کہ اسداللہ خاں کا دربار اور نمبر اور خلعت بدستور بحال و برقرار رہے۔ میں نے پوچھا کہ حضرت یہ امر کس اصل پر متفرع ہوا؟ فرمایا کہ ہم کو کچھ معلوم نہیں بس اتنا جانتے ہیں کہ یہ حکم دفتر میں لکھوا کر ۱۴ دن یا ۱۵ دن بعد ادھر کو روانہ ہوئے ہیں میں نے کہا سبحان اللہ ؎

کارساز ما بفکر کار ما　　　فکر ما در کار ما آزار ما

سہ شنبہ ۲۳ مارچ کو ۲ بجے نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے مجھکو بلایا خلعت عطا کیا۔ اور فرمایا کہ لارڈ صاحب بہادر کے ہاں کا دربار و خلعت بھی بحال ہے۔ انبالہ جاؤ گے تو دربار و خلعت پاؤ گے۔ عرض کیا گیا حضور کے قدم دیکھے خلعت پایا۔ لارڈ صاحب بہادر کا حکم سن لیا۔ نہال ہو گیا۔ اب انبالہ کہاں جاؤں جیتا رہا تو اور دربار میں کامیاب ہو رہوں گا ؎

کار دنیا کسے تمام نہ کرد　　　ہر چہ گیرید مختصر گیرید

سر ولیم میور اور غالب

پنشن قدیم اکیس مہینہ سے بند۔ اور میں سادہ دل فتوح جدید کا آرزومند پنشن کا احاطہ پنجاب کے حکام پر مدار رہے۔ سو ان کا یہ شیوہ اور یہ شعار رہے کہ روپیہ دیتے ہیں، نہ جواب

نہ مہربانی، نہ عتاب، خیر اس سے قطع نظر کی ۱۸۵۶ء سے بموجب تحریر وزیر اود ھ عطیہ شاہی کا امیدوار ہوں تقاضا کرتے ہوئے شرماؤں۔ اگر گنہگار ٹھہرتا تو گولی یا پھانسی سے مرتا۔ اس بات پر کہ میں بے گناہ ہوں مقید اور مقتول نہ ہونے سے آپ اپنا گواہ ہوں پیشگاہ گورنمنٹ کلکتہ میں جب کوئی کاغذ بھجوایا ہے۔ بقلم چیف سکرٹر بہادر اس کا جواب پایا ہے۔ ایک بار دو کتابیں بھیجیں۔ ایک پیشکش گورنمنٹ اور ایک نذر شاہی ہے نہ اسکے قبول کی اطلاع۔ نہ اسکے ارسال سے آگاہی ہے جناب ولیم میور صاحب بہادر نے بھی عنایت نہ فرمائی انکی بھی کوئی تحریر مجھکو نہ آئی۔ یہ سب ایک طرف اب خبریں ہیں مختلف سے کہتے ہیں کہ چیف سکرٹر بہادر لفٹننٹ گورنر ہو گئے یہ کوئی نہیں کہتا کہ ان کی جگہ کون سے صاحب عالیشان چیف سکرٹر ہوئے۔ مشہور جناب ولیم میور صاحب بہادر صدر بورڈ میں تشریف لے گئے یہ کوئی نہیں کہتا کہ لفٹننٹ گورنری کے سکرٹری کا کام کس کو دے گئے۔

انگریزوں کے احسان کی یاد شریف ہندوستانی کے دل میں

جناب آرنلڈ صاحب بہادر آج تشریف لے گئے۔ سنتا ہوں کہ کلکتہ جائیں گے میم اور بچوں کو ولایت بھیجکر پھر آئیں گے۔ مجھ سے وہ سلوک کر گئے ہیں۔ اور مجھ پر وہ احسان کر گئے ہیں کہ قیامت تک ان کا شکر گزار رہوں گا۔

غدر میں تم کہاں تھے

خدا جب کا بھلا کرے۔ مجھکو ڈپٹی کمشنر نے بلا بھیجا تھا۔ صرف اتنا ہی پوچھا کہ غدر میں تم دلی تھے؟ جو مناسب ہوا وہ کہا گیا۔ دو ایک خط آمدہ ولایت میں نے پڑھائے تفصیل لکھ نہیں سکتا انداز ادا سے پنشن کا بحال و برقرار رہنا معلوم ہوتا ہے۔ مگر پندرہ مہینے پچھلے ملتے نظر نہیں آتے۔

غالب کی مفلسی کوتوالی میں

یہ تو آفت دلی ہی پر ٹوٹ پڑی ہے لکھنو کے سوا اور شہروں میں عملداری کی وہ صورت ہے جو غدر سے پہلے تھی۔ اب یہاں ٹکٹ چھاپے گئے ہیں میں نے بھی دیکھے۔ فارسی عبارت یہ ہے۔

"ٹکٹ آبادی ور درون شہر دہلی بشرط ادخال جرمانہ" مقدار روپئے کی حاکم کی رائے پر ہے۔ آج پانچ ہزار ٹکٹ چھپ چکا ہے۔ کل اتوار یوم التعطیل ہے۔ پرسوں دوشنبہ سے دیکھئے یہ کاغذ کیونکر تقسیم ہوں۔ یہ تو کیفیت شہر کی ہے۔ میرا حال سنو بائیس مہینے کے بعد پرسوں کوتوال کو حکم آیا ہے کہ اسد اللہ خاں پنشن دار کی کیفیت لکھو۔ کہ وہ بے مقدور اور محتاج ہے کہ نہیں۔ کوتوال نے موافق ضابطہ کے مجھ سے چار گواہ مانگے ہیں۔ سو کل چار گواہ کوتوالی چبوترے جائیں گے۔ اور میری بے مقدوری ظاہر کر آئیں گے کہیں یہ نہ سمجھنا کہ بعد ثبوت مفلسی چڑھا ہوا روپیہ مل جائے گا اور آئندہ کو پنشن جاری ہو جائیگا۔

کوتوالی میں اظہار مفلسی کے واقعہ کو کس رقت خیز انداز سے لکھا ہے کہ مجبوری سب کچھ کراتی ہے۔ اس پر بھی یہ یقین نہیں کہ نتیجہ مفید نکلیگا۔

شرفا کی تصویر افلاس

پنشن کا حال کچھ معلوم نہیں۔ حاکم خط کا جواب نہیں لکھتا۔ عملہ میں ہر چند تفحص کیجیے کہ ہمارے خط پر کیا حکم ہوا۔ کوئی کچھ نہیں بتاتا۔ بہر حال اتنا سنا ہے اور دلائل اور قرائن سے معلوم ہوا ہے کہ میں بے گناہ قرار پایا ہوں اور ڈپٹی کمشنر بہادر کی رائے میں پنشن پانے کا استحقاق رکھتا ہوں پس اس سے زیادہ نہ مجھے معلوم نہ کسی کو خبر میں کیا ہوں

کہاں سے چھپواتا۔ روٹی کھانے کو نہیں۔ شراب پینے کو نہیں۔ جاڑے آتے ہیں لحاف توشک کی فکر ہے۔ کتابیں کیا چھپواؤنگا۔

یہ غالب نے اپنا ہی حال نہیں لکھا۔ بلکہ غدر کے بعد جو حالت شرفائے دہلی کی ہوگئی تھی اس کی تصویر بھی دکھادی ہے۔

جو لوگ بے امنی کے خواستگار ہیں۔ ان حالات کو ذرا نظر عبرت سے پڑھیں۔

گورنر جنرل نے غالب کی قدردانی کی

صاحب کمشنر بہادر دہلی یعنی جناب سانڈرس صاحب بہادر نے مجھکو بلایا۔ پنجشنبہ ۲۴ر فروری کو میں گیا۔ صاحب شکار کو سوار ہو گئے تھے۔ میں الٹا پھر آیا۔ جمعہ ۲۵ر فروری کو گیا۔ ملاقات ہوئی۔ کرسی دی۔ بعد پرسش مزاج کے ایک خط انگریزی چار ورق کا اٹھا کر پڑھتے رہے جب پڑھ چکے تو مجھ سے کہا کہ یہ خط ہے منٹگمری صاحب حاکم اکبر صدر بورڈ پنجاب کا تمہارے باب میں لکھتے ہیں کہ ان کا حال دریافت کرکے لکھو۔ سو ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ تم ملکہ معظمہ سے خلعت کیا مانگتے ہو؟ حقیقت کہی گئی۔ ایک کاغذ آمدہ ولایت سے گیا تھا وہ پڑھوا دیا۔ پھر پوچھا۔ تم نے کتاب کیسی لکھی ہے؟ اس کی حقیقت بیان کی۔ کہا ایک منٹگمری صاحب دیکھنے کو مانگتے ہیں اور ایک ہم کو دو۔ میں نے عرض کیا۔ کل حاضر کروں گا پھر پنشن کا حال پوچھا۔ وہ گزارش کیا، اپنے گھر آیا۔ اور خوش آیا۔ حاکم پنجاب کو مقدمہ ولایت کی کیا خبر۔ کتابوں سے کیا اطلاع پنشن کی پرسش سے کیا مدعا۔ یہ استفسار بحکم نواب گورنر جنرل کا ہوا ہے اور یہ صورت مقدمہ فتح و فیروزی ہے۔

کتاب دستنبو نے گورنر جنرل کے خیالات غالب کی طرف متوجہ کئے جیسا کہ میں نے ایک جگہ لکھا ہے۔ اس عبارت سے اس خیال کی مزید تائید ہوتی ہے۔

—— *(※)* ——

سنہ ۱۸۶۰ء میں املاک واگزاشت

دربار لارڈ صاحب کا میرٹھ میں ہوا دلی کے علاقہ کے جاگیردار بموجب حکم کمشنر دہلی میرٹھ گئے۔ بموافق دستورِ قدیم مل آئے۔ غرضکہ پنجشنبہ ۲۹ ر۔ دسمبر کو پہر دن چڑھے لارڈ صاحب یہاں پہنچے۔ کابلی دروازہ کی فصیل کے تلے ڈیرے ہوئے۔ اسی وقت توپوں کی آواز سنتے ہی میں سوار ہوگیا۔ میر منشی سے ملا۔ ان کے خیمہ میں بیٹھکر صاحب سکرٹر کو خبر کروائی۔ جواب آیا کہ فرصت نہیں۔ یہ جواب سنکر ناامیدی کی پوٹ باندھکر لے آیا۔ ہرچند پنشن کے باب میں ہنوز لا ونعم نہیں مگر کچھ فکر رہا ہوں۔ دیکھوں کیا ہوتا ہے۔ لارڈ صاحب کل یا پرسوں جانے والے ہیں۔ یہاں کچھ کلام و پیام نہیں۔ ممکن تحریر ڈاک میں بھیجی جائے گی۔ دیکھئے کیا صورت پیش آئے گی۔ مسلمانوں کی املاک کے واگزاشت کا حکم عام ہوگیا ہے۔ جن کو کرایہ پر ملی ہے ان کو کرایہ معاف ہوگیا ہے۔ آج یکشنبہ یکم جنوری سنہ ۱۸۶۰ء ہے پہر دن چڑھا ہے۔

—— *(※)* ——

سنہ ۱۸۵۵ء کے اعلان ملکہ وکٹوریہ سے صرف جان بخشی ہوئی تھی۔ جائداد کی رہائی خصوصاً مسلمانوں کی املاک کی واگزاشت سنہ ۱۸۶۰ء میں ہوئی جیسا کہ غالب نے لکھا ہے۔

—— *(※)* ——

گورنر غالب کے بسیار مہربان دوستان

نواب لفٹننٹ گورنر بہادر

غرب وشمال کو نسخہ دستنبو بسبیل ڈاک بھیجا تھا۔ اُن کا خط فارسی مشعر تحسین عبارت و قبول صدق ارادت و مودت بسبیل ڈاک آگیا۔ پھر قصیدہ بہاریہ تہنیت و مدحت میں بھیجا گیا۔ اس کی رسید آگئی وہی خاں صاحب بسیار مہربان دوستان القاب اور کاغذ افشانی۔ ازاں بعد ایک قصیدہ جناب رابرٹ منٹگمری صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر قلمرو پنجاب کی مدح میں بتوسط صاحب کمشنر بہادر دہلی گیا۔ اس کے جواب میں بھی خوشنودی نامہ بتوسط کمشنر بہادر کل مجھ کو آگیا۔ پنشن ابھی تک مجھ کو نہیں ملی۔

اِس عبارت سے کئی باتیں نئی معلوم ہوئیں۔ ایک تو گورنر کا فارسی میں خط لکھنا۔ دوسرے مشرقی القاب سے مخاطب کرنا تیسرے مشرقی یعنی افشانی کاغذ پر خط لکھا جانا جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ غدر کے بعد سے انگریزوں نے یہاں کے رسم ورواج کو کتنا زیادہ ترک کر دیا ہے اور یہی وجہ ہے ان کے غیر ہر دل عزیز ہو جانے کی ہے۔

غالب نے ہر جگہ پنشن کو مذکر لکھا ہے۔ مگر یہاں مونث لکھتے ہیں اس سے ظاہر ہوا کہ پنشن کا استعمال دونوں طرح جائز ہے۔

سر جان لارنس اور غالب

عرضی میری سر جان لارنس چیف کمشنر بہادر کو گزاری۔ اس پر دستخط ہوئے کہ یہ عرضی مع کاغذ ضمیمہ سائل بھیجی جائے اور یہ لکھا جائے کہ معرفت صاحب کمشنر دہلی کے پیش کرو۔ اب سر رشتہ دار کو لازم تھا کہ میرے نام موافق دستور کے خط لکھتا۔ یہ نہ ہوا وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی میرے پاس آگئی۔ میں نے خط صاحب کمشنر چارلس سانڈرس کو لکھا۔ اور وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی اس میں ملفوف کر کے بھیجدی۔ صاحب کمشنر نے صاحب

کلکٹر کے پاس یہ حکم چڑھا کر بھیجی کہ سائل کے پنشن کی کیفیت لکھو۔ اب وہ مقدمہ صاحب کلکٹر کے ہاں آیا ہے۔ ابھی صاحب کلکٹر نے تعمیل اس حکم کی نہیں کی۔ پرسوں تو انکے ہاں یہ روبکاری آئی ہے۔ دیکھئے کچھ مجھ سے پوچھتے ہیں یا اپنے دفتر سے لکھ بھیجتے ہیں۔ دفتر کہاں رہا جو اس کو دیکھیں گے۔ بہرحال یہ خدا کا شکر ہے کہ بادشاہی دفتر میں سے میرا نام کچھ شمول فساد میں پایا نہیں گیا۔ اور میں حکّام کے نزدیک یہانتک پاک ہوں کہ پنشن کی کیفیت طلب ہوئی ہے۔ اور میری کیفیت کا ذکر نہیں ہے یعنی سب جانتے ہیں کہ اس کو لگاؤ نہ تھا۔

افلاس شاعری پر بھی غالب ہے

ہمیشہ نواب گورنر جنرل کی سرکار سے دربار میں مجھ کو سات پارچے اور تین رقم جواہر خلعت ملتا تھا۔ لارڈ کیننگ صاحب میرا دربار و خلعت بند کر گئے ہیں۔ ناامید ہو کر بیٹھ رہا۔ اور مدت العمر کو مایوس ہو رہا اب جو یہاں لفٹنٹ گورنر پنجاب آئے ہیں میں جانتا تھا کہ یہ بھی مجھ سے نہ ملیں گے۔ کل انہوں نے مجھکو بلا بھیجا۔ بہت ہی عنایت فرمائی اور فرمایا کہ لارڈ صاحب دلی میں دربار نہ کرینگے میرٹھ ہوتے ہوئے اور میرٹھ میں ان اضلاع کے علاقہ داروں اور مالگزاروں کا دربار کرتے ہوئے انبالہ جائیں گے۔ دلی کے لوگوں کا دربار وہاں ہوگا تم بھی انبالہ جاؤ۔ شریک دربار ہو کر خلعت معمولی لے آؤ۔ کیا کہوں کہ کیا میرے دل پر گزری۔ گویا مردہ جی اٹھا مگر ساتھ اس مسرت کے یہ بھی سناٹا گزرا کہ سامان سفر انبالہ و مصارف بے انتہا کہاں سے لاؤں۔ اور طرّہ یہ کہ نذر معمولی میری قصیدہ ہے۔ ادھر قصیدہ کی فکر ادھر روپیہ کی تدبیر۔ حواس ٹھکانے نہیں۔ شعر کام دل و دماغ کا ہے۔ وہ روپیہ کی فکر میں پریشان۔ میرا خدا یہ مشکل بھی آسان کرے گا۔

دن کی روٹی رات کی شراب

بہ نسبت حکیم احسن اللہ خاں کے جو بات

مشہور ہے۔ وہ محض غلط۔ ہاں مرزا الٰہی بخش جو شاہزادوں میں ہیں۔ ان کو حکم کراچی بندر جانے کا ہے۔ اور وہ انکار کر رہے ہیں۔ دیکھئے کیا حکم ہو۔ حکیم جی کو ان کی حویلیاں مل گئی ہیں۔ اب وہ مع قبائل ان مکانوں میں جا رہے ہیں اتنا حکم ان کو ہے کہ شہر سے باہر نہ جائیں۔ رہا میں۔ ع

تو ہیکسی و غوبی ترا کہ می پرسد

نہ جزا۔ نہ سزا۔ نہ نفرین۔ نہ آفرین۔ عدل۔ نہ ظلم۔ نہ لطف۔ نہ قہر۔ ۱۵ دن پہلے تک دن کو روٹی رات کو شراب ملتی تھی۔ اب صرف روٹی ملے جاتی ہے۔ شراب نہیں۔ کپڑا ایام تنعم کا بنا ہوا ابھی ہے۔ اس کی کچھ فکر نہیں۔

حکیم احسن اللہ خاں صاحب کی نسبت دلی میں مشہور ہوا تھا کہ وہ بھی جلا وطن کئے جائیں گے۔ اس کی طرف اشارہ ہے۔ میرزا الٰہی بخش کی جلاوطنی منسوخ ہوئی۔ اور۔ وہ مرتے دم تک درگاہ حضرت سلطان جیؒ میں رہے۔ غالب کی قبر کے پاس ان کا شاندار مکان بنا۔ جواب کھنڈر پڑا ہے۔ جلاوطنی ہی منسوخ نہیں ہوئی بلکہ بارہ سو روپے ماہوار پنشن بھی نسلاً بعد نسل دی گئی۔ جو ان کے بیٹوں میرزا سلیمان شکوہ عرف بنے میرزا ثریا جاہ اور میرزا اقبال شاہ میں تقسیم ہوئی اور اب میرزا ثریا جاہ کے مرنے کے بعد ان کی بیگمات دور ثا کو ملتی ہے میرزا الٰہی بخش اور ان کے لڑکے درگاہ حضرت سلطان جیؒ کے شرقی رُخ سنگِ سرخ کی جالیوں کے اندر دفن ہیں۔ میرزا الٰہی بخش آخر میں خیرخواہِ سرکار ثابت ہوئے تھے۔ بہادر شاہ کے سمدھی تھے۔

غدر کے دفتر شاہی میں غالب کا نام نہ تھا

دفتر شاہی میں میرا نام مندرج

نہیں نکلا۔ کسی مخبر نے نسبت میرے کوئی خبر بد خواہی کی نہیں دی۔ حکام وقت میرا ہونا شہر میں جانتے ہیں۔ فراری نہیں ہوں۔ روپوش نہیں ہوں۔ بلایا نہیں گیا۔ دار و گیر سے محفوظ ہوں۔ کسی طرح کی باز پرس ہو تو بلایا جاؤں۔ مگر ہاں جیسا کہ بلایا نہیں گیا خود بھی برنئے کار نہیں آیا۔ کسی حاکم سے نہیں ملا۔ خط کسی کو نہیں لکھا۔ کسی سے درخواست ملاقات نہیں کی۔ مئی سے پنشن نہیں پایا۔ یہ دس مہینے کیونکر گزرے ہونگے۔ انجام کچھ نظر نہیں آتا۔

غالب کی جان پٹیالہ کے سبب بچی

میں حکیم محمد حسن خاں کے مکان میں نو۔ دس برس سے کرایہ کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا بلکہ دیوار بدیوار ہیں۔ گھر حکیموں کے۔ اور وہ نوکر ہیں راجہ نرندر سنگھ بہادر والی پٹیالہ کے۔ راجہ نے صاحبان عالیشان سے عہد لے لیا تھا کہ بروقت غارت دلی یہ لوگ بچ رہیں۔ چنانچہ بعد فتح راجہ کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا۔ ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں۔ امیر غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے تھے وہ نکالے گئے۔ جاگیردار، پنشن دار۔ دولتمند اہل حرفہ کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمان قلعہ پر شدت ہے۔ اور بازپرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں۔ مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامے میں شریک ہوئے ہیں۔ میں غریب شاعر دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں۔ خواہی اسکو نوکری سمجھو خواہی مزدوری جانو۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجا لاتا رہا۔ اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے۔ مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات پائی نہیں گئی۔ لہذا طلبی نہیں ہوئی۔ ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں۔ میری کیا حقیقت تھی۔ غرضکہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازہ سے

باہر نہیں نکل سکتا سوار ہونا اور کہیں جانا اور کہیں ؟ نا تو بہت بڑی بات ہے رہا یہ کوئی میرے پاس آوے۔ شہر میں ہے کون جو آوے ؟ گھر گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں جرنیلی بند و بست یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال مجکو نہیں معلوم بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حکام کو توجہ بھی نہیں۔ دیکھئے انجام کار کیا ہوتا ہے۔ یہاں باہر سے اندر تک کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا ابھی دیکھا چاہیے مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہی یا نہیں؟

پنشن کی نسبت

میں اجرائے پنشن سرکار انگریزی سے مایوس تھا بارے وہ نقشہ پنشنداروں کا جو یہاں سے بنکر صدر کو گیا تھا اور یہاں کے حاکم نے نسبت میرے صاف لکھدیا تھا کہ یہ شخص پانے کا مستحق نہیں ہے گورنمنٹ نے برخلاف یہاں کے حاکم کی رائے کے میری پنشن کے اجرا کا حکم دیا اور وہ حکم یہاں آیا اور مشہور ہوا میں نے بھی سنا۔ اب کہتے ہیں کہ ماہ آیندہ یعنی مئی کی پہلی کو تنخواہوں کا بٹنا شروع ہوگا۔ دیکھا چاہیے پچھلے روپے کے باب میں کیا حکم ہوتا ہے۔

دہلی کا دردناک مرثیہ

بسکہ فعال ما یرید ہے	ہر سلحشور انگلستان کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے	زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جسکو کہیں وہ مقتل ہے	گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک	تشنہ خوں ہے ہر مسلمان کا
کوئی واں سے نہ آسکے یہاں تک	آدمی واں نہ جاسکے یہاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا	وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کئے شکوہ	سوزش داغہائے پنہاں کا

گاہ رو کر کہا کئے باہم ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے غالبؔ کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

یہ مرثیہ محض شاعری نہیں بلکہ واقعاتِ غدر کی تاریخی تصویر ہے
چاندنی چوک میں پھانسیاں کھڑی ہوئی تھیں جن پر روزانہ سینکڑوں
آدمیوں کو لٹکایا جاتا تھا بمسلمانوں کے ساتھ خصوصیت سے سختی برتی جاتی
تھی۔ انہی امور کو غالب نے غمناک انداز سے لکھا ہے۔

انگریز بھی غالب کے شاگرد تھے

جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں تو یہ مصرعہ پڑھکر چپ ہو جاتا ہوں۔ ع
لے مرگِ ساں تجھے کیا انتظار ہے
یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ جو دکھ مجھ کو ہے اس کا بیان تو معلوم مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریزی قوم میں سے جو ان رو سیاکالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے اس میں کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز کچھ دوست کچھ شاگرد، کچھ معشوق۔ سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کو زیست کیونکر نہ دشوار ہو۔ ہائے اتنے یار مرے کہ جواب میں مروں گا تو میرا کوئی رونیوالا بھی نہ ہوگا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۵۷ پڑھا نہیں گیا۔

غالب کی انصاف پسندی دیکھنا۔ غدر کے مصائب کو بلا تعصب بیان کرتے ہیں۔ انگریزوں پر جو مظالم ہوئے ان کو بھی قلم پر لاتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔

کہ غدر سے پہلے انگریز دیسی شعرا کے شاگرد ہوتے تھے۔ اور شرفا سے
دوستیاں کرتے تھے اب یہ باتیں کہانیاں ہوگئیں۔

غالب انگریزوں کے خیرخواہ تھے

حکم ہوا ہے کہ دوشنبہ کے دن پہلی تاریخ نومبر کو رات کے وقت سب خیرخواہانِ انگریز اپنے اپنے گھروں میں روشنی کریں اور بازاروں میں اور صاحب کمشنر بہادر کی کوٹھی پر بھی روشنی ہوگی۔

فقیر بھی اس تہیدستی میں کہ اٹھارہ مہینے سے پنشن مقرری نہیں پاتا، اپنے مکان پر روشنی کرے گا۔

اِس عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے جو کہیں کہیں انگریزوں کے خلاف الفاظ استعمال کئے ہیں یہ اُس وقت کی عام زبان تھی ورنہ جشن میں شرکت۔ گھر پر روشنی کرنا صاف ظاہر کرتا ہے کہ وہ حکومت سے عناد نہ رکھتے تھے۔

تمام شُد

خلاصہ کتاب دستنبو کا ترجمہ

میں حامیان اُردو کی طرف سے جناب میرزا یعقوب بیگ صاحب نامی ایم۔ اے بی۔ ٹی دہلوی کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنے جدِ امجد دبیر الملک میرزا غالبؔ کی مشہور کتاب دستنبو کا اُردو ترجمہ کر دیا اور جس بے نظیر چیز کا کتاب ہذا کے شروع میں غالب نے جگہ جگہ ذکر کیا ہے وہ لباس اردو پہنکر ناظرین کے سامنے آگئی۔

جناب نامی کے دادا جناب میرزا فتح اللہ بیگ المعروف بہ میرزا رجب بیگ مرحوم میرزا غالب کے چچازاد بھائی تھے۔ نامی صاحب میں بھی باوجود انگریزی کا اعلیٰ تعلیمیافتہ ہونے کے اپنے اجداد کی طرح سپاہیانہ ولولہ اور شاعرانہ نزاکت طبع پوری آن بان سے موجود ہے۔ انہوں نے کتاب دستنبو (جسکے معنی گلدستہ کے ہیں) کا وہ تمام ضروری خلاصہ لے لیا ہے جسکا تعلق غدر کے احوالِ تاریخی سے تھا۔ اور کمال یہ ہے کہ ترجمہ ایسا سلیس اور صاف کیا کہ بالکل غالب کا رنگ معلوم ہوتا ہے اور مفہوم کتاب کی ادائگی میں کسی قسم کی کمی بیشی نہیں ہوئی۔ غالب نے ایام غدر میں یہ کتاب لکھی تھی جبکہ شرفا اور خصوصاً مسلمانوں کا سانس خوف و مایوسی سے گھٹ رہا تھا اس واسطے اگر انکی رائے زنی میں مصلحتِ وقت کا پہلو زیادہ نمایاں نظر آئے تو موجودہ نسلوں کو اعتراض نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ غالب نے باوجود نزاکتِ وقت بعض باتیں ایسی آزادی و بیباکی سے لکھدیں کہ کوئی دوسرا لکھنا چاہتا تو دار و گیر کے اُس ہولناک وقت میں نہ لکھ سکتا۔

دستنبو کا مروجہ نسخہ کشوری مطبع کا ہے جو ایسا غلط اور خراب کاغذ پر چھپا ہے کہ اسکا عدم وجود برابر ہے۔ مگر نامی صاحب نے اسکی صحت کی پوری جستجو فرمائی اور نواب سر فرخ میرزا صاحب رئیس لہارو کے بھائی مولانا ضمیر میرزا صاحب کے خاص کتب خانہ کے صحیح نسخہ سے غلطیاں درست کیں اسکے بعد ترجمہ کیا۔ دستنبو کا ترجمہ آسان نہ تھا کیونکہ وہ نہایت سخت فارسی میں ہے مگر نامی صاحب نے دو دن کے اندر اتنے مشکل کام کو آسان کر کے دیدیا میں مکرر انکا شکریہ ادا کرتا ہوں حسن نظامی

واقعہ غدر پر مصنف کی رائے

آج ابتری کا زمانہ ہے۔ ہر ایک نے اپنی چال کو چھوڑا ہے۔ سپاہ نے ہر جگہ سپہ سالار سے منھ موڑا ہے۔ بلکہ زمانہ خود اپنی چوکڑی بھولا ہے۔ ستارہ شناسوں کی رائے ہے کہ جب یزدجرد شاہِ ایران پر غازیانِ عرب کے ہاتھوں تباہی آئی تو برج سرطان میں زحل اور مریخ کا اتصال تھا اور وہ تباہی اسی اتصال کا نتیجہ تھی۔ آجکل پھر برج سرطان میں مریخ اور زحل کا اجتماع ہوا ہے۔ اسی لئے ہر طرف فتنہ و فساد جنگ و جدال برپا ہے مگر اہل دانش اس بات کو کب مانیں گے۔ وہاں دو مختلف ملکوں کی فوجوں کے درمیان جنگ تھی۔ یہاں فوج نے خود اپنے بادشاہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ہے اس لئے ان دونوں حملوں میں کوئی مشابہت اور دونوں حملہ آوروں میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ وہاں ایک مذہبی جنگ تھی جس کے بعد اہل اسلام نے نئی شان وشوکت کے ساتھ ویران ایران کو شاد و آباد کیا اور نئے مذہب یعنی اسلام نے ملک کو نور ایمان سے معمور اور ظلمتِ آتش پرستی کو ملک سے دور کیا۔ لیکن یہاں کی لڑائی قانونی ہے، حیران ہوں۔ اہل ہند نے کس نئے قانون کی امید میں یہ بیر بسایا ہے اہل فارس نے آتش کو کھو کر خدا کو پایا۔ لیکن متحیر ہوں کہ اہل ہند نے کس امید پر ارباب عدل و انصاف کا دامن چھوڑا اور درندہ خصال باغیوں سے رشتہ جوڑا ہے۔ انصاف کی پوچھو تو جو شخص امن و امان، چین و آرام سوائے قلمرو انگریزی کے کہیں اور تلاش کرتا ہے۔ نابینا ہے۔ ایران میں تیغ عرب کے زخم خوردوں کو اسلام نے تلافی کا مرہم عطا کیا۔ ہند میں غدر کی مصیبت کے بعد وہ کونسی راحت ہے جس کے زمانہ نے مصیبت زدگان غدر کے مصائب کی تلافی کی ہے۔ ارباب دانش بتلائیں کہ وہ کونسی بہتری اور بہبودی ہے جو اس ہنگامۂ غدر سے ملک و ملت کو حاصل ہوگی؟

اہل ملک والیان ملک سے لڑ رہے ہیں۔ لشکری سالار لشکر کا خون کر رہے ہیں اور پھر خوش ہیں، خدا کے غضب سے نہیں ڈرتے۔ کہاں ہیں حکمت الٰہی کے جاننے والے۔ کہاں ہیں نفع و نقصان، نیک و بد کے پہچاننے والے بتلائیں کہ کیا اس ہنگامہ کا گرم ہونا غضب الٰہی کے سوا کسی اور وجہ سے ہو سکتا ہے۔

باغیوں کا دہلی میں داخل ہونا اہل شہر کی بے بسی اور انگریزوں کا کشت و خون

۱۶ رماہ رمضان ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو علی الصباح یکایک دہلی کی شہر پناہ اور قلعہ کی در و دیوار میں زلزلہ پیدا ہوا یعنی میرٹھ چھاؤنی سے کچھ باغی سپاہی بھاگ کر دہلی آئے۔ سب کے سب بغاوت پر کمر بستہ اور انگریزوں کے خون کے پیاسے تھے۔ شہر پناہ کے محافظوں نے جو باغیوں کے ساتھ ہم پیشہ ہونے کی وجہ سے قدرتاً ہمدردی رکھتے تھے اور جو ممکن ہے پہلے سے ان کے ساتھ عہد و پیمان بھی کر چکے ہوں۔ دروازے کھول دیئے اور حق نمک اور حفاظت شہر کو بالائے طاق رکھکر ان ناخوانده یا خوانده مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ ان سبک عناں سواروں اور تیز رفتار پیادوں نے جب شہر کے دروازوں کو کھلا ہوا اور دربانوں کو مہمان نواز پایا تو دیوانہ وار ہر طرف دوڑ پڑے اور جہاں جہاں انگریز افسروں کو پایا قتل کر ڈالا اور ان کی کوٹھیوں میں آگ لگا دی اہل شہر جو سرکار انگریزی کے نمک خوار تھے اور حکومت انگریزی کے سایہ میں امن و امان کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے ہتھیار سے بیگانہ۔ تیر و تبر میں بھی امتیاز نہ کر سکتے تھے نہ ہاتھ میں تیر رکھتے تھے، نہ شمشیر۔ سچ پوچھو تو یہ لوگ صرف اس مطلب کے تھے کہ گلی کوچوں کو آباد کریں۔ ان لوگوں کے ہرگز نہ تھے کہ جنگ و جدل کے واسطے کمربستہ ہوں اس کے علاوہ تیز رو سیلاب کو گھاس پھوس کب روک سکتا ہے۔ ان غریبوں نے اپنے آپکو

اس آفت ناگہانی کے آگے عاجز اور بے بس پایا اس لئے گھروں کے اندر غم اور
ماتم میں بیٹھ رہے۔ بندہ بھی انہی ماتم زدگان میں سے ہے۔ گھر میں بیٹھا تھا کہ شور وغوغا
بلند ہوا۔ قبل اس کے کہ سبب دریافت ہو چشم زدن میں صاحب ایجنٹ بہادر کے
قلعہ میں مارے جانے کی خبر آئی ساتھ ہی معلوم ہوا کہ سوار اور پیادے ہر گلی کوچہ
میں گشت لگا رہے ہیں۔ پھر تو کوئی جگہ ایسی نہ تھی جو گل اندا موں کے خوں سے
سے رنگین نہ ہو اور باغ میں کوئی جائے گل گشت ایسی نہ تھی جو ویرانی میں مانند
گورستان نہ ہو۔ کیسے کیسے انگریز افسر، منصف مزاج، دانشور، نیک خو، نام آور
تلوار کے گھاٹ اترے۔ کیسی کیسی پری چہرہ، نازک اندام، خاتونانِ فرنگ خاک
وخوں میں نہائیں۔ افسوس ان کے ننھے ننھے بچے جن کی شگفتہ روئی لالہ وگل پر
ہنستی تھی اور جن کی خوش خرامی کبک وچکور کو شرماتی تھی کس طرح تیغ بیدریغ کے
نذر ہوئے۔ اگر موت ان مقتولوں کے سرہانے ماتم میں سیاہ پوش ہو کر گریہ وزاری
کرے تو روا ہے۔ اگر آسمان خاک ہو کر برسے اور زمین غبار ہو کر اڑے تو بجا ہے ؎

اے نوبہار چوں تن بسمل بخوں بغلط | اے روزگار چوں شب بے ماہ تار شو
اے آفتاب روئے بسیلی کبود کن | اے ماہتاب داغ دل روزگار شو

باغیوں کا طرزِ عمل اور اس پر مصنف کی رائے

خدا خدا کر کے وہ دن گزرا اور شام ہوئی، سیاہ دل باغیوں
نے نہ صرف جا بجا شہر میں قیام کیا بلکہ قلعہ میں شاہی باغ کو اصطبل اور شاہی محلسرا کو
اپنی خوابگاہ بنایا۔ رفتہ رفتہ دوسرے مقامات سے خبر آئی کہ باغی سپاہیوں نے
فوجی افسروں اور انگریز عہدہ داران کو قتل کر دیا۔ اور جوق جوق سپاہی اور کاشتکار
متفق اور متحد ہوئے ہیں اور سب کے سب بغاوت پر کمر بستہ ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا
ہے کہ سب کے سب جھاڑو کی طرح ایک ہی بندھن میں بندھے ہوتے ہیں کیوں نہ ہو،

ہندوستان پر اس طرح جھاڑو پھیرنے کے لئے کہ اگر آرام و آسایش گھاس کے تنکے کے برابر بھی ڈھونڈ ہیں تو کہیں میسر نہ آئے ایک ایسی ہی جھاڑو کی ضرورت ہے ہزار ہا لشکر جمع ہو رہا ہے۔ مگر ہر لشکر ایک بے سری فوج ہے۔ تماشہ یہ ہے کہ توپ بندوق۔ گولہ بارود سب انگریزوں ہی سے حاصل کیا اور پھر انگریزوں ہی سے لڑائی ہے۔ قواعدِ جنگ، فنون سپہگری سب انگریزوں ہی سے سیکھے اور انگریزوں ہی کے مقابلہ میں انکے استعمال کی تیاری ہے۔ آخر دل ہی سنگ و خشت تو نہیں کہ نہ جلے۔ آنکھ ہے روزنِ دیوار نہیں کہ نہ روئے دل کیوں نہ جلے کہ بیگناہ انگریزوں کے قتل کا داغ لئے ہوئے ہے۔ آنکھ کیوں نہ روئے کہ ہندوستان کی تباہی دیکھ رہی ہے۔ شہر والیان شہر سے خالی ہو کر بے آقا کے غلاموں سے معمور ہیں۔ چور اور ڈاکوں کو نہ گرفتاری کا ڈر ہے نہ قید کا خطر۔ محلے ویران اور بازار لوٹ کا میدان ہیں۔ ڈاک بند ہے جس سے نہ صرف نامہ و پیام بلکہ تمام کام درہم برہم ہیں، حامیان دین و آئیں فرمائیں کہ کیا یہ رونے کا مقام نہیں کہ ڈاک جیسی نعمت خدا داد درہم برہم ہو جائے جس کے یہ معنی ہیں کہ مصیبت نازل ہوا اور عزیزوں کو مصیبت کی خبر تک نہ ہو۔ نیرنگیِ زمانہ دیکھئے کہ جو کشور کشائی اور جانبازی کا دم بھرتے تھے آج اپنے سایہ سے ڈرتے ہیں اور نقیب و چوبدار شاہ و گدا سب پر حکومت کرتے ہیں۔ پھر ستم یہ کہ مصیبت پر گریہ و ماتم کرو تو نشانہ ملامت و ظرافت بنو۔ اگر اس آفت سے بیزار اور اس ماتم میں سینہ فگار ہو تو ضعفِ ایمان کے طعنے سنو۔

دہلی میں باغیوں کا اجتماع اور لڑائی کا آغاز

الغرض سرکش باغیوں نے شہر میں داخل ہوتے ہی جو کچھ زر و مال اپنے ساتھ لائے تھے۔ سب شاہی خزانہ میں داخل کر دیا اور آستانِ شاہی پر جبین اطاعت کو رکھا۔ چشم زدن میں بے انتہا فوج دہلی میں جمع ہو گئی چونکہ

ضعیف بادشاہ اس بے شمار لشکر کو نہ روک سکا، اور قابو میں نہ رکھ سکا، بے قابو ہوگیا اور لشکر کے قابو میں آگیا۔ باغیوں کا قاعدہ تھا کہ جہاں جہاں سے گزرتے قید خانوں سے قیدیوں کو چھوڑتے جاتے تھے، چنانچہ پرانے پرانے قیدی قید سے رہا ہوکر دربار میں حاضر ہوئے اور خدمتگاری اور سرداری کے باصرار خواستگار ہوئے۔ کمال یہ ہے کہ ہر شخص کو دربار شاہی میں باریابی حاصل ہو جاتی تھی غرض شہر کے اندر اور باہر کم وبیش پچاس ہزار پیادے اور سوار جمع ہوگئے۔ انگریزوں کے پاس علاقہ دہلی میں سے سوائے اس پہاڑی کے جو شہر کے پہلو میں واقع ہے اور کچھ باقی نہ رہا چنانچہ ان اہل دانش نے اسی جائے تنگ میں دمدمے اور مورچے بنائے اور ان پر زبردست توپیں لگائیں۔ دلیسیوں نے بھی جو توپیں میگزین سے اڑائی تھیں ان کو لیجا کر قلعہ پر نصب کیا اور دونوں جانب سے گولہ باری شروع ہوئی مئی اور جون کی گرمی تھی اور آفتاب کی حرارت دن بدن زیادتی پر تھی۔ باغی ہر روز صبح کو انگریزی فوج کے مقابلہ کے واسطے نکلتے اور سورج غروب ہونے سے پہلے واپس آجاتے تھے۔

حکیم احسن اللہ خانصاحب پر حملہ

اندرونِ شہر کی کیفیت بھی سننے کے قابل ہے۔ ایک شخص جو حکیم احسن اللہ خاں صاحب کا پروردہ اور آوردہ تھا اور جو خیانت سے بہت کچھ روپیہ جمع کرچکا تھا اس خیال سے کہ جب تک حکیم صاحب جنکو اس کی خُرد بُرد کا علم تھا، زندہ ہیں راز فاش ہونے کا اندیشہ رہیگا ان کے قتل کے درپے ہوا، اور یہ افواہ اڑائی کہ حکیم صاحب انگریزوں کے خیر خواہ اور طرفدار ہیں اس طرح باغیوں کو ان کے خلاف برانگیختہ کیا، چنانچہ ایک روز بدبخت باغی حکیم صاحب کو قتل کرنے کے لئے ان کے دولت کدہ پر حملہ آور ہوئے۔ مگر خوش قسمتی سے حکیم صاحب اس وقت قلعہ میں بادشاہ

کی خدمت میں تشریف رکھتے تھے۔ چنانچہ ان ناہنجاروں میں سے کچھ لوگ قلعہ پہنچے اور حکیم صاحب کو گھیر لیا۔ بادشاہ سلامت نے اپنے آپ کو حکیم صاحب پر ڈالدیا اور انکی جان بچائی اگرچہ حکیم صاحب کی جان بچ گئی مگر بدبخت باغیوں کو اس وقت تک چین نہ آیا جبتک انہوں نے حکیم صاحب کا مکان لوٹ کر اس میں آگ نہ لگادی افسوس کوئی غلام جبتک اسکی اصل میں فرق نہ ہو اپنے آقا کے ساتھ ایسا نہ کرے گا۔

بہادر شاہ کے معاون جب شاہی جھنڈے کے نیچے بکثرت پیادہ وسوار جمع ہو گئے تو تفضل حسین خان والیٔ فرخ آباد نے جو پہلے کبھی بادشاہ کیطرف رُخ بھی نہ کرتا ایک خط کے ذریعہ اپنی اطاعت کا اظہار کیا۔ ادھر خان بہادر خاں نے بریلی میں ایک عظیم الشان لشکر جمع کر کے علمِ بغاوت بلند کیا اور ایک سو ایک اشرفیاں اور آراستہ ہاتھی گھوڑے بادشاہ کیخدمت میں بطور پیشکش روانہ کئے۔ لیکن نواب یوسف علی خان بہادر فرمان روائے رامپور نے جن کی دوستی سرکار انگریزی کیساتھ بیحد استوار تھی بادشاہ کیخدمت میں ایک خشک پیام ہی بھیجنے پر اکتفا کی اور یہ بھی صرف ہمسایوں کے طعنوں سے بچنے کیواسطے کیا۔ لکھنؤ میں بغاوت شروع ہوتے ہی صاحبان انگریز شہر سے نکل گئے اور دیگر مستحکم مقامات میں اپنے بھائیوں اور فدائیوں سے جا ملے لیکن بعض افسران انگریز اپنے ہمراہیوں سمیت لکھنؤ ہی میں مقام بیلی گارد میں قلعہ بند ہو گئے شرف الدولہ نے جو شاہان اودھ کا وزیر مشہور تھا واجد علی شاہ کی اولاد میں سے ایک دہ سالہ لڑکے کو تخت پر بٹھایا اور خود وزیر بنا اور ایک پیشکش گران بہا بادشاہ دہلی کیخدمت میں روانہ کیا جب یہ نذرانہ بادشاہ کیخدمت میں پہنچا تو بادشاہ کو اپنی کامیابی کی کافی امید ہو گئی اور خیال کیا کہ پھر ستارۂ اقبال چمکا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے بعد بادشاہ کا ستارہ اقبال ہمیشہ کیلئے غروب ہو گیا۔

شہر دہلی کے اندر لڑائی اور قتل و غارتگری اور اسپر مصنف کی رائے | ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء

کو انگریزی سپاہ نے اس شد و مد کے ساتھ کشمیری دروازہ پر گولہ باری کی کہ کالوں کی سپاہ میں بھاگڑ پڑ گئی۔ اگرچہ گیارہ مئی سے چودھویں ستمبر تک چار ماہ اور چار روز کا وقفہ تھا لیکن چونکہ شہر دوشنبہ ہی کے روز ہاتھ سے نکلا اور دوشنبہ ہی کو پھر قبضہ میں آگیا۔ اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ ایک ہی دن کے اندر شہر ہاتھ سے نکلا اور ہاتھ میں آگیا۔

غرض فتحمند فوج اس سڑک سے جوان کے سامنے تھی شہر میں داخل ہوئی جو شخص راہ میں ملا قتل کر دیا گیا۔ معززین شہر اپنی آبرو کو بچائے ہوئے گھروں میں پڑے رہے باغی شہر سے بھاگ نکلے۔ کچھ ایسے تھے جنہوں نے مقابلہ کیا اور سینہ سپر ہو کر لڑے اپنے نزدیک دوسروں کو کاٹا۔ مگر میرے نزدیک اہل دہلی کی جڑیں کاٹ گئے۔ دو تین روز تک شہر میں کشمیری دروازہ سے لیکر چاروں طرف کوچہ و بازار میدان کارزار بنے رہے۔ رفتہ رفتہ صرف تین دروازے یعنی اجمیری دروازہ، ترکمان دروازہ اور دہلی دروازہ کالوں کے قبضہ میں رہ گئے۔ گوروں نے شہر میں داخل ہوتے ہی بیگناہوں اور بینواؤں کو قتل کرنا شروع کیا اور جا بجا مکانات میں آگ لگا دی۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی مقام سخت خونریزی کے بعد حملہ آور کے قبضہ میں آتا ہے تو اس مقام کے رہنے والوں پر اسی قسم کی سختیاں اور مصیبتیں نازل ہوتی ہیں۔

جب اہل شہر نے فتحمندوں کی یہ کینہ وری اور غیظ و غضب دیکھا تو انکی امید ناامیدی سے بدل گئی۔ اور بے شمار غربا و شرفا اپنی مستورات کو لیکر ان تینوں دروازوں میں سے شہر چھوڑ کر نکل گئے اور شہر کے باہر چھوٹی چھوٹی بستیوں اور قبرستانوں میں جا کر دم لیا۔ جب وہاں بھی چین نہ ملا تو ان میں سے بہت سے سفر کے مصائب اٹھاتے دور دراز مقامات میں چلے گئے۔

۱۴ ستمبر کے بعد پانچ روز تک شہر کے اندر کالے اور گوروں میں جا بجا لڑائی ہوتی رہی یہاں تک کہ رفتہ رفتہ کالے پیچھے ہٹتے گئے اور گورے شہر پر قابض

ہوتے گئے۔ بالآخر ۲۰ ستمبر کو جمعہ کے روز شہر کالوں سے خالی ہوگیا اور دہلی اور قلعہ دہلی پر انگریزوں کا پورا پورا تسلط ہوگیا۔ اسکے بعد پکڑ دھکڑ قتل و غارتگری کا بازار اور زیادہ گرم ہوا۔

گوروں کا تشدد اور اسپر مصنف کی رائے

یہ بات پوشیدہ نہ رہے کہ اس شہر گردی میں مختلف علاقوں میں طریقہ سخت گیری مختلف رہا اور تشدد و تظلم سب پر یکساں نہ تھا۔ ہر شخص کے رویہ اور حیثیت کے مطابق اس پر ظلم ہوا اپنے علم کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ انگریزی سپاہیوں کو حکم یہ تھا کہ جو شخص اطاعت قبول کرے اس کے قتل سے ہاتھ اٹھائیں اور صرف اسکو لوٹ لینے ہی پر اکتفا کریں۔ مگر جو شخص مقابلہ کرے اس کو قتل کر دیں۔ اور اس کا گھر بار لوٹ لیں۔ اب جو لوگ مارے گئے ان پر یہی گمان کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے سرتابی کی ہوگی۔ مشہور بھی یہی ہے کہ انگریزی سپاہ نے زیادہ تر لوگوں کا مال و متاع لوٹ لیا مگر ان کی جانوں کو کوئی گزند نہ پہنچایا لیکن کہیں کہیں ایک دو محلوں میں ایسا بھی ہوا کہ لوگوں کو قتل بھی کیا گیا اور ان کا مال و اسباب بھی لوٹ لیا گیا لیکن بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کے قتل سے ہمیشہ پرہیز کیا گیا اس کے مقابلہ میں اہل انصاف ہندوستانیوں کا برتاوہ یاد کریں بتلائیں کہ ایسی صورت میں جبکہ دشمنی اور کینہ دری کی کوئی معقول وجہ موجود نہ ہو اور آقا کشی گناہ خیال کیجاتی ہو اپنے آقا پر تلوار کھینچنا اور بے گناہ عورتوں اور شیرخوار بچوں کو قتل کرنا کہاں تک قرین انصاف ہے۔ برخلاف اسکے انگریزوں کے طرز عمل پر غور کیجیے کہ دشمنوں سے انتقام لینے اور مجرموں کو سزا دینے کی غرض سے کھڑے ہوتے ہیں۔ اہل شہر سے بیحد بددل اور ناراض ہیں۔ اس پر بھی غلبہ پانے کے بعد جبکہ دلی کے کتے بلی کو بھی زندہ نہ چھوڑنا چاہیے تھا وہ غصہ کو ضبط کرتے ہیں، عورتوں اور بچوں کو ہاتھ نہیں لگاتے، بے قصور اور قصوروار میں پورا پورا فرق کرتے ہیں، اور کسی شخص کو سوائے ان لوگوں کے جنکو باز پرس کے واسطے بلاتے ہیں حیران نہیں کرتے۔ اہل شہر میں سے بہت سے شہر بدر کر دیے گئے

جو باقی ہیں، امید و بیم کی حالت میں ہیں۔
۱۷؍اکتوبر چہار شنبہ کو روز شہر میں اکیس توپوں کی سلامی ہوئی حیرانی ہوئی کہ لفٹنٹ گورنر بہادر کی آمد پر ۱۷ توپوں کی سلامی ہوتی ہے، اور نواب گورنر جنرل بہادر کی آمد پر ۱۹ توپوں کی سلامی اترتی ہے۔ ۲۱ توپوں کی سلامی چہ معنی دارد کسی سے کچھ نہ معلوم ہو سکا گمان غالب یہ ہے کہ غالباً سپاہ انگریزی کو کسی مقام پر باغیوں پر کوئی زبردست فتح حاصل ہوئی ہے۔

باغیوں کے زیر اثر مقامات

اگرچہ دہلی میں فتنہ فرو ہو گیا۔ مگر ابھی بدکردار باغیوں نے ایک طرف بریلی، فرخ آباد اور لکھنؤ میں شورش برپا کی ہے، اور دوسری طرف سوہنہ اور میوات کے علاقہ میں فتنہ کی آگ بھڑکا رکھی ہے۔ تلارام نامی ایک شخص نے کچھ دنوں۔ ریواڑی میں شورش برپا کی پھر دیوباں میو کے ساتھ ملک میوات کے پہاڑ اور جنگلات میں انگریزوں کے مقابلہ کے لیے آمادہ ہوا۔

نواح دہلی کے رئیسوں کا قلعہ میں اجتماع

جس ہفتہ میں انگریزی سپاہ نے شہر پر قبضہ کیا اسی ہفتہ میں امین الدین احمد خاں بہادر وضیاء الدین احمد بہادر اپنے اہل عیال کیساتھ تین ہاتھی اور چالیس تیز رفتار گھوڑوں پر سوار ہو کر اپنی جاگیر لوہارو کیطرف روانہ ہوئے۔ مہر دلی پہنچکر ایک دو روز قیام کیا۔ دوران قیام میں لشکریاں غارتگران پر آن پڑے اور جو کچھ پاس تھا لوٹ کر لے گئے چنانچہ بے سروسامانی کی حالت میں یہ رؤسائے ذیشان دوجانہ کیطرف روانہ ہوئے۔ حسن علی خان بہادر والی دوجانہ نے نہایت مہربانی اور فیاضی سے حق مہمان نوازی ادا کیا جب صاحب کمشنر بہادر کو خبر ہوئی تو بلایا چنانچہ وہ رؤسائے آسمان شان پھر جانب دہلی روانہ ہوئے۔ صاحب بہادر کی خدمت میں پہنچے اور آداب بجالائے صاحب بہادر نے طنز آمیز گفتگو شروع کی لیکن جب نرم اور نادمانہ و مصالحانہ جواب سنا تو خاموش ہو رہے اور قلعہ میں قیام کرنیکی اجازت دی۔ دو تین روز بعد حکم ہوا کہ عبدالرحمٰن خان والی جھجر کو گرفتار کر لائیں جب وہ رئیس والاشان وارد دہلی ہو

تو اس کو قلعہ میں دیوانِ عام میں ایک طرف قیام کرنیکا حکم ہوا اور اس کی تمام ریاست انگریزی علاقہ میں شامل کر لی گئی۔ اسی طرح ۳۰ اکتوبر جمعہ کے روز احمد علی خاں والیٔ فرخ نگر کو گرفتار کر کے دہلی لائے اور قلعہ میں ایک علیحدہ جگہ اتارا۔ ۲ نومبر شنبہ کے روز بہادر جنگ خاں والیٔ بہادر گڑھ کو دہلی لایا گیا اور اس کے واسطے بھی قلعہ ہی میں جائے قیام مقرر ہوئی۔ اسی طرح بروز شنبہ راجہ ناہر سنگھ والیٔ بلب گڑھ بھی قلعہ میں لائے گئے۔ نواحِ دہلی میں سات ریاستیں دہلی کی ایجنٹی سے متعلق ہیں۔ جھجر۔ بہادر گڑھ۔ بلب گڑھ لوہارو۔ فرخ نگر۔ دوجانہ اور پاٹودی۔ ان سات ریاستوں میں سے پانچ ریاستوں کے رئیس اس وقت قلعہ میں جدا جدا مقام پر مقیم تھے۔ پاٹودی اور دوجانہ کے رئیس اپنی اپنی ریاستوں میں خوف زدہ سکتہ کے عالم میں منتظر تھے کہ دیکھئے پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔

انہی ایام میں مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خاں اور ذوالفقار الدین حیدر خاں بھی اپنے متعلقین کے ساتھ شہر سے نکل کھڑے ہوئے اور اپنے بھرے بھرائے گھر لوٹ کے حوالہ کر گئے۔ شہزادگان خاندان تیموری میں سے کچھ لڑائی میں مارے گئے۔ کچھ گرفتار ہو کر قیدخانوں میں پڑے ہوئے اپنے دن پورے کرتے ہیں۔ معدودے چند ایسے تھے جو جان بچا کر بھاگ گئے۔ ضعیف العمر بادشاہ کی گرفتاری کا حکم صادر ہوا کہ بادشاہ کو ہیں لیجائے والیانِ جھجر، بلب گڑھ اور فرخ نگر کو علیحدہ مختلف اوقات میں پھانسی دیدی گئی۔

حکیم محمود خاں صاحب اور ساٹھ اور آدمیوں کو حوالات

۱۸۵۸ء کے آغاز میں جنوری کے مہینہ میں ہندوستانیوں کی خطائیں معاف ہوئیں اور لوگ پھر شہر میں واپس آنے لگے۔ اسی اثنا میں حاکمِ شہر کو چغلخوروں نے خبر دی کہ راجہ نرندر سنگھ بہادر کے معالج یعنی حکیم محمود خاں صاحب کا مکان مسلمانوں کیلئے جائے پناہ بنا ہوا ہے۔ اور بہت ممکن ہے کہ ایک دو باغی بھی ان لوگوں میں ہوں جو حکیم صاحب کے ہاں پناہ گزیں ہیں تھے چنانچہ ۲ فروری شنبہ کے روز حاکم مذکور دوڑ لیکر آگیا اور مالک خانہ

مع ساٹھ اور آدمیوں کے پکڑ کرلے گیا۔ اگرچہ چند روز تک سب کو حوالات رہی لیکن حکیم صاحب کی عزت و آبرو کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا۔ بالآخر حکیم محمود خاں حکیم مرتضےٰ خاں اور ان کے چچازاد بھائی حکیم عبد الحکیم خاں کو واپسی کی اجازت ہوگئی۔ ۱۲ر فروری کو کچھ لوگ اور چھوڑ دیئے گئے۔ ۱۳ر فروری کو تین آدمیوں نے اور رہائی پائی مگر نصف سو زائد آدمی حوالات ہی میں ہے۔

لکھنؤ میں لڑائی اور شہر پر قبضہ اسی ماہ میں سر جان لارنس صاحب چیف کمشنر بہادر کی آمد آمد کی خبر شہر میں گرم ہوئی۔ اور ۲۰ فروری شنبہ کے روز شام کے وقت ۲۱ توپوں کی سلامی سے شہر گونج اٹھا۔ دوسرے دن صبح کو معلوم ہوا کہ شہر لکھنؤ فتح ہوگیا۔ ساتھ ہی یہ بھی سُنا کہ لکھنؤ میں ۱۶ فروری کو کمانڈر انچیف بہادر نے نہایت بہادری کیساتھ باغیوں پر ایک ایسا سخت حملہ کیا کہ ان کے دھوئیں اڑا دیئے۔ دوسرے ذریعہ سے معلوم ہوا کہ یہ توپیں لکھنؤ کی فتح کی سلامی نہ تھی بلکہ سپاہِ انگریزی کو باغیوں پر جو نمایاں غلبہ حاصل ہوا ہے اس کی خوشی میں چھوڑی گئیں تھیں۔ چوبیسؔ فروری چہار شنبہ کے روز صبح کے وقت صاحب چیف کمشنر بہادر کا دہلی میں ورود ہوا۔ ۱۳ توپوں کی سلامی ہوئی اور اہل شہر کے تن مردہ میں پھر جان آئی۔ ؎

در کالبدِ شہر رواں باز آمد فرمان فرمائے شہ نشاں باز آمد
زین شاہی و خوشدلی کہ رو داد بہ شہر گوئی کہ مگر شاہجہاں باز آمد

۲۷ر فروری شنبہ کے روز اس رحم دل حاکم نے فریادیوں کی دادرسی کی اور امن وامان کا مژدہ سُنایا۔

اہل دہلی کی مصائب آجکل قید خانہ شہر کے باہر اور حوالات شہر کے اندر ہے ان میں قیدیوں کا دم بجوم ہے کہ الامان والحفیظ۔ ان کے علاوہ جو لوگ پھانسی چڑھ گئے انکی تعداد خدا ہی خوب جانتا ہے۔ آجکل دہلی میں مسلمان ہزار آدمیوں سے زیادہ نہوں گے۔ گروہا گروہ کلمہ گو شہر سے نکل کر دو دو تین تین کوس پرے کھنڈرات میں اور پرانوں میں۔

پہاڑ کے کھہ دانوں میں زندگی کے دن پورے کرتے ہیں۔ جو لوگ شہر میں باقی رہ گئے ہیں ان میں یا تو قیدیوں کے عزیز وا قربا ہیں اور یا پنشن خوارانِ سرکار ہیں۔

باغیوں کا ہر جگہ قلع وقمع

اٹھارہ مارچ بروز پنجشنبہ شام کیوقت گردوں شگاف توپوں کی آواز نے خبر دی کہ لکھنؤ میں کامل طور پر انگریزی تسلط ہو گیا۔ اپریل کے مہینہ میں حکیم محمود خاں صاحب کے ساتھیوں نے جو اس وقت تک حوالات میں تھے رہائی پائی۔ اور حکیم صاحب اپنے عزیز وا قربا کیساتھ پٹیالہ کی طرف روانہ ہوئے۔ مئی کے شروع میں خبر آئی کہ انگریزی سپاہ نے مرادآباد و باغیوں سے خالی کرالیا۔ اور فتح کے بعد مرادآباد نواب یوسف علی خاں صاحب والیِ رامپور کی قلمرو میں شامل کیا گیا۔ اس کے بعد انگریزوں نے بریلی کو فتنہ پرداز باغیوں سے خالی کیا چنانچہ اب قوی امید ہے کہ عنقریب انگریزی سپاہ ہر جگہ باغیوں کا قلع وقمع کر دیگی اور پھر تمام ہندوستان از سرِ نو سرکار انگریزی کے سایۂ عدل وانصاف میں آ جائیگا۔

۱۳ رجون یکشنبہ کے روز شام کیوقت بہادر جنگ خاں والیِ بہادر گڑھ کو بلا کر حکم جان بخشی سنایا گیا۔ اور ساتھ ہی ایک ہزار روپے ماہوار وظیفہ کا مژدہ دیا گیا۔

۲۲ رجون کو ۲۱ توپوں کی سلامی نے خبر دی کہ انگریزی سپاہ کی جانبازانہ کوششوں سے گوالیار اور قلع گوالیار فتح ہو گیا جس کی مختصر روداد یہ ہے کہ باغیانِ سرکش دیگر مقامات کیطرح گوالیار پر بھی قابض ہو گئے تھے۔ راجہ گوالیار مہاراجہ جیاجی راؤ شہر اور شہر یاری چھوڑ کر آگرہ بھاگ گیا۔ اور انگریزوں سے مدد مانگی۔ انگریزوں نے ایک جرار فوج سے اس کی مدد کی چنانچہ راجہ نے انگریزی فوج کی مدد سے باغیوں کو شکست فاش دی۔

باغیوں کا حشر

باغیوں کا جو کچھ حشر ہوا وہ ان کے کردار کی کافی سزا تھی۔ یہ گمراہ سرکش ہر طرف سے ہزیمت پا کر گوالیار پہنچے لیکن جب وہاں بھی شکست فاش کھائی تو مدت تک رواں دواں پھرتے رہے، اور رہزنی اور ڈاکہ زنی کرتے پھرے۔ آخر کار ہر جگہ نہایت ذلت وخواری کیساتھ ایک ایک کر کے مارے گئے۔

مضمون دستنبو پر رائے

رسالہ دستنبو کا ترجمہ ختم ہوا۔ میرزا آنامی نے جس خوبی سے دستنبو کا ترجمہ کیا اسکی تعریف کرنی مشکل ہے جو لوگ ترجمہ کی دشواریوں سے واقف ہیں وہ دستنبو کا اصل متن سامنے رکھینگے تو ان کو بے اختیار اس ترجمہ کی داد دینی پڑیگی کہ غالب کی سخت اور مشکل فارسی عبارت کا جس کو عربی الفاظ سے دانستہ مخلوط رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ایسا عام فہم اور صحیح ترجمہ کیا گیا ہے کہ تعجب ہوتا ہے۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ ترجمہ کے الفاظ غالب کی اردو طرز تحریر سے مشابہ کر دیئے گئے ہیں اور بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ یہ غالب ہی کی لکھی ہوئی عبارت ہے۔ تیسری خوبی یہ ہے کہ ترجمہ کا انداز بالکل روزنامچہ کا سا بنا دیا گیا ہے تاکہ کتاب روزنامچہ کی عبارت سے بے میل معلوم نہ ہو۔ یہ تمام کمالات معمولی نہیں ہیں اور میرزا آنامی کی غیر معمولی قابلیت کو ظاہر کرتے ہیں۔

آجکل کے زمانہ میں غالب کی یہ تحریر شاید لوگوں کو پسند نہ آئیگی کیونکہ انہوں نے ہندوستانی باغیوں کی خطاؤں کو بہت نمایاں کر کے دکھایا ہے اور انگریزی لشکر کی زیادتیوں پر احتیاط و مصلحت کا پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے میں کہتا ہوں کہ غالب کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ باغیوں نے انگریزوں کی عورتوں اور بچوں کے ساتھ بے قصور زیادتیاں کیں جو انکے مذہب اور ملک کے روایات کے سراسر خلاف حرکات تھیں انگریزی فوج نے ہندوستانی عورتوں اور بچوں پر کوئی ایسا نمایاں ظلم نہیں کیا جو قابل ذکر ہو۔ البتہ غالب نے اس کتاب میں حالات کی نزاکت کے سبب جرأت نہیں کی کہ انگریزی لشکر نے باغیوں کے علاوہ شہری باشندوں سے بھی بڑی سفاکی کے ساتھ انتقام لیا اور بے گناہ دلی کے بیشمار آدمیوں کو پھانسی پر لٹکا دیا وہ تاریخ کا نہایت افسوسناک واقعہ ہے اور خود انگریز مدبروں اور مورخوں کو اسکا اقرار ہے کہ دہلی فتح کرنیکے بعد انگریزی لشکر نے بیگناہ لوگوں کا قتل عام کر کے برٹش انصاف اور تحمل کو داغدار بنا دیا۔

بہرحال میرا مقصد تو غالب مرحوم کے ایک ادبی اور تاریخی کارنامہ کو اردو زبان کے ذخیرہ میں بڑھانا تھا۔ غدر کے اسباب کی بحث سے مجھے کچھ سروکار نہیں اسکا فیصلہ مورخ کرینگے کہ حق پر کون تھا اور ناحق پر کون۔

حسن نظامی

۷۸۶ ھوالکل یامعین

غدر دہلی کے افسانوں کا آٹھواں حصہ

دلی کی جان کنی

دردناک عکسی تصویرات سمیت

غدر ۱۸۵۷ء کے

وہ حالات جو دہلی میں خاندان شاہی اور امرا اور تمام ہندو مسلمان باشندگان دہلی کو پیش آئے

خواجہ حسن نظامی دہلوی کے جمع کردہ

معتبر تاریخی واقعات

جون ۱۹۲۳ء میں دوسری بار ابن عربی کارکن حلقہ مشائخ دہلی نے شائع کئے

دوسری بار ۲۰۰۰ مطبوعہ [illegible] دہلی باہتمام لالہ [illegible] قیمت ۸ ؍

دہلی کی جاں کنی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یا اللہ توبہ۔ کل کی بات ہے دہلی شہر کے اندر ایسی قیامت آئی تھی جسکا ذکر سُننے سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ کی باغی فوج دہلی میں داخل ہوئی اور انگریزوں کا قتل عام شروع کیا، اس دن سے ۱۴ تک دہلی شہر میں انگریزوں کی حالت جاں کنی اور سکرات کی تھی اور اُن پر کمبخت باغیوں نے اس قدر ظلم ڈہائے تھے جنکا بیان کرنے کو بھی پتھر کا کلیجہ چاہیئے۔

پھر ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کے بعد جب انگریزی فوج نے دوبارہ دہلی فتح کر لی اور باغیوں کو بھگا دیا، تو دہلی کے ہندو مسلمانوں پر خصوصًا مسلمانوں پر وہ آفت آئی جسکا بیان کرنا اور آنسو بہانے کے بغیر سُن لینا آسان نہیں اور جس کو "دہلی کی جاں کنی" کے نام سے تعبیر کرنا بالکل سچی اور واقعی بات ہے۔

اِنہی واقعات کو جو ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی میں پیش آئے قلمبند کیا جاتا ہے اور اسی مجموعہ کا نام "دہلی کی جاں کنی" ہے۔

یہ تمام حالات تاریخی ہیں، ان میں ایک بات بھی زبانی افواہوں سے تعلق نہیں

رکھتی۔ اسواسطے یہ مجموعہ ایک مستند تاریخ کی حیثیت رکھتا ہے۔

حالات یا تو انگریزی تاریخوں سے اقتباس کئے گئے ہیں جنکا حوالہ اپنے موقع پر دیدیا ہے یا شمس العلماء منشی ذکاءاللہ مرحوم کی تاریخ ہندوستان سے لیئے گئے ہیں، منشی صاحب مذکور خود غدر کے ایام میں موجود تھے اور اتنی عقل اور سمجھ رکھتے تھے کہ واقعات کو اُن کی اصلی صورت میں ایک اچھے مورخ کی طرح لکھ سکتے تھے جنانچہ انھوں نے اپنی تاریخ میں جسقدر غدر دہلی کے حالات لکھے ہیں اُن کا بڑا حصہ چشم دید کیفیات سے تعلق رکھتا ہے۔

کتابوں سے زیادہ زبانی حالات کا انبار عظیم بھی میرے پاس جمع ہے۔ کیونکہ دہلی کے ہر ائس ہندو مسلمان عورت مرد سے جو غدر میں موجود تھا ملنے اور حالات معلوم کرنے کا مجکو بچپن سے شوق ہے۔

لیکن اس کتاب میں اُن ہی زبانی روایتوں کو درج کیا گیا ہے جن کی سند کسی معتبر اور چھپی ہوئی تاریخ میں بھی ہو، کیونکہ ایک کتاب میں نے غدر کے متعلق ایسی بھی لکھی ہے جسمیں سوائے زبانی حکایات کے تاریخی تائید کا کچھ دخل نہیں ہے اور وہ "غدر دہلی کے افسانوں کا پہلا حصہ" ہے۔ اسواسطے اس کتاب میں سوائے تاریخی حالات کے زبانی قصّوں سے بہت کم سروکار رکھا گیا ہے۔

میں نے اب تک حالات غدر دہلی کے متعلق سات کتابیں اور رسالے شائع کئے ہیں، جو ہندوستان میں اچھی طرح مقبول و رائج ہیں، ان میں پہلا حصہ وہ ہے جسکا ذکر اوپر آیا، اور دوسرے میں انگریزوں کی بپتا کا حال ہے، جو انپر فوج کی بغاوت کے بعد دہلی میں پڑی، اور تیسرے حصہ میں انگریزوں کے ابتدائی محاصرہ کے حالات خطوط ہیں۔ چوتھے میں بہادر شاہ کے مقدمہ کا حال ہے پانچویں میں وہ خطوط ہیں جو غدر کے وقت بہادر شاہ کے نام لوگوں نے یا بادشاہ

نے دوسروں کے نام روانہ کیے، اور جو بادشاہ کی گرفتاری کے بعد قلعہ دہلی میں انگریزوں کے ہاتھ گرفتار ہوئے۔ چھٹے حصہ میں اُن اخباروں کا اقتباس ہے جو ایام غدر میں دہلی شہر کے اندر شائع ہوتے تھے، اور جنکے مضامین کی نسبت یہ شبہ کیا گیا تھا کہ وہ غدر کی آگ بھڑکانے کا باعث ہوئے۔ ساتویں حصہ میں میرزا غالب کا روزنامچہ ہے جو اُنہوں نے زمانۂ غدر کے حالات کی نسبت لکھا تھا۔

سلسلۂ مذکور میں اس کتاب کو آٹھواں حصہ سمجھنا چاہیئے، اسمیں تمام و کمال تاریخی حالات ہیں، اور حالات بھی وہ جن سے دہلی کی مصیبت کا پورا اندازہ ہوجاتا ہے یقیناً وہ مصیبت جو اہل دہلی کو اس زمانہ میں پیش آئی، جاں کنی کی مصیبت سے بھی زیادہ سخت تھی، اور اسکا اندازہ کتاب کے پڑھنے سے اچھی طرح ہو جائیگا کہ اس کتاب کا نام "دہلی کی جاں کنی" رکھا گیا ہے تو غلط اور مبالغہ سے نہیں رکھا بلکہ واقعی طور پر دہلی نے اس زمانہ میں جاں کنی سے بھی زیادہ تکلیف برداشت کی۔ جسکا بیان سنکر پتھر کا کلیجہ بھی موم ہوکر پگھل جاتا ہے۔

مقصدِ تحریر

اس کتاب کی تالیف کا مقصد صرف یہی ہے کہ قوم و ملک کی آئندہ و موجودہ نسلوں کو اپنے پایۂ تخت کے تاریخی انقلابات سے آگاہی ہو، نیز وہ یہ بھی دیکھ لیں کہ لڑائی جھگڑے میں کیسے کیسے مصائب و ہولناک تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے آج کل کے زمانہ میں بعض ناتجربہ کار جوشیلے نوجوان لڑائی و خونریزی کے خواب دیکھا کرتے ہیں، اُن کو یہ کتاب اچھی طرح بیدار کردے گی، کہ بے امنی کے نتائج ایسے ہوتے ہیں، اور وہ جان لیں گے کہ برٹش گورنمنٹ کے خلاف سرکشی کرنا بہت خطرناک بات ہے، اور تمام ہندوستان کی مشترکہ قوت بھی اُس کے شیرازہ حکمرانی کو

پراگندہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

نایاب تصاویر

اس کتاب کے لئے بڑی کوشش و تلاش کے بعد چند نایاب تصاویر بھی حاصل کی گئی ہیں، تاکہ ایام غدر کے نامور اشخاص کی اصلی صورتیں لوگ دیکھ سکیں۔

(۱) ایک ان میں بادشاہ کے دربار کا گروپ ہے جس میں تمام امرا صف بستہ حاضر ہیں، اس گروپ کی نسبت کہا جاتا ہے کہ بہادر شاہ کا نہیں ہے بلکہ اُن کے والد اکبر شاہ کے دربار کا ہے، خیر چونکہ اس سے دربار کی ہیئت ظاہر ہوتی ہے، اس واسطے اس کو بھی شریک کتاب کرنا غیر موزوں نہیں ہوگا۔

(۲) دوسرا گروپ بھی بہادر شاہ کے دربار کا ہے، اس میں چند بڑے بڑے نامور لوگ موجود ہیں، جنکا غدر سے خاص تعلق تھا، مثلاً شہزادہ جواں بخت۔ میرزا الٰہی بخش حکیم احسن اللہ خان۔ نواب حامد علی خان۔ محبوب علی خان۔

(۳) میرزا مغل بہادر شاہ کے بیٹے تھے اور غدر میں باغی افواج کے سپہ سالار بنائے گئے تھے، ان کی تصویر بڑی تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔

(۴) بہادر شاہ کی سکرات کا مرقع بہت دردناک اور تاریخ کا وہ حصہ ہے جو انسان کو عبرت و خوف سے رُلا دیتا ہے۔

یہ تصویریں کہاں سے ملیں؟

بہادر شاہ کا بڑا گروپ عام طور سے بازاروں میں بکتا ہے۔ چھوٹا گروپ جناب لالہ سری رام صاحب ایم۔ اے مصنف "خمخانۂ جاوید" کے قلمی تصویر خانہ سے لیا گیا ہے اور بہت معتبر ہے۔ میرزا مغل اور بہادر شاہ کی سکرات کی تصویر محکمہ آثار قدیم دہلی کے سپرنٹنڈنٹ

سے حاصل ہوئی ہیں اس واسطے بالکل یقینی اور معتبر ہیں۔

بہادر شاہ کے وقت آخر کی تصویر میں میں نے کچھ اصلاح کرائی ہے کیونکہ وہ صاف نہ تھی، بہادر شاہ کی چارپائی کے پاس حقہ کی نے ایسی بُری معلوم ہوتی تھی کہ اُس کو مجبوراً جُدا کرانا پڑا تاکہ چہرہ اچھی طرح نظر آسکے۔

ان تصاویر کے حاصل کرنے اور ان کی تیاری و اصلاح میں جو کچھ زحمت ہوئی اُس سے مجھے ان کی قدر و قیمت اچھی طرح یاد رہے گی، اور اُمید ہے کہ ناظرین بھی اُس نایاب تحفہ کو معمولی نظروں سے نہ دیکھیں گے۔ کیونکہ مہینوں کی جد و جہد کے بعد یہ حاصل ہوئی ہیں۔

اب میں کتاب کا اصل مضمون شروع کرتا ہوں، اور اسکا سلسلہ اُس وقت سے چلتا ہے جبکہ انگریزوں نے دوبارہ دہلی کو فتح کرنے کے لئے حملہ شروع کیا۔ اسکے قبل کے واقعات اور کچھ بعد کے حالات اس کتاب کے گزشتہ حصوں میں مذکور ہو چکے ہیں، اسواسطے اُن کو نہیں لکھا گیا۔

ؔ

۷ رشعبان ۱۳۴۰ھ یوم چہار شنبہ مطابق ۶ راپریل ۱۹۲۲ء نماز ظہر کے بعد شروع کیا۔

حجرہ رین بسیرا
درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی (رضی اللہ عنہ) دہلی

حسن نظامی

دہلی انگریزوں سے کیوں ناراض تھی؟

بغاوت ہندوستان کے اسباب انگریزوں نے بھی لکھے ہیں اور ہندوستانیوں نے بھی، انگریزوں اور ہندوستانیوں کے اکثر خیالات کا خلاصہ منشی ذکاءاللہ صاحب نے اپنی تاریخ میں لکھدیا ہے، سرسید احمد خان صاحب نے بھی ایک لاجواب رسالہ "اسباب بغاوت ہند" کے نام سے لکھا ہے جس کی صداقت پارلیمنٹ انگلستان تک تسلیم کی گئی تھی،

مگر میں یہاں نہ اُن تمام اسباب کو لکھنا چاہتا ہوں نہ اُن پر بحث کرنیکی کچھ ضرورت معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہ کتاب صرف احوال دہلی سے تعلق رکھتی ہے اور دہلی کے اسباب ناراضی کو شروع میں بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ بعد کے واقعات کی حقیقت سمجھنے میں یہ اسباب مدد دے سکیں۔

دہلی سے مراد اُس شہر کے ہندو مسلمان باشندے اور بہادر شاہ بادشاہ اور اُن کے خاندان والے ہیں، اور انہی لوگوں نے بعد میں غدر کو مدد دی، اور پھر انگریزی فوج کے ستم برداشت کئے۔ لہذا یہاں صرف دہلی والوں کے اسباب ناراضی بیان کر کے اصل کتاب شروع کی جائے گی۔

ان اسباب میں زیادہ تر بہادر شاہ اور اُن کے خاندان کی ناراضی کا بیان ہے مگر یہ وہ ناراضی تھی جس کا اثر تمام باشندگان شہر پر پڑتا تھا، اور دہلی کا بچہ بچہ اس سے متاثر ہوتا تھا جسوقت بادشاہ اپنی تکلیف کو کسی شعر کے ذریعہ ظاہر کرتے تھے تو شہر کی گلی گلی میں اسکا چرچا ہوتا تھا۔ چنانچہ ولیعہدی کے جھگڑے میں جب بہادر شاہ نے یہ شعر کہا ؎

اے ظفر اب ہی تجھی تک انتظامِ سلطنت بعد تیرے نے ولیعہدی نہ نام سلطنت

تو دہلی کے ہر گھر میں اسکا ذکر تھا۔ عورتیں تک اس شعر کو پڑھکر روتی تھیں، بچے گلیوں میں مرثیہ کے انداز سے گاتے پھرتے تھے

اسباب ناراضی کا سلسلہ پوری طرح ذہن نشین نہ ہوگا جبتک شاہ عالم بادشاہ کے وقت سے واقعات کو شروع نہ کیا جائے لہذا پہلے اُن کو لکھا جاتا ہے۔

شاہ عالم بادشاہ اور انگریز

سنہ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک اور ولزلی کے سپاہیوں نے مرہٹوں کے زور کو شکست دی، اور شاہ عالم بادشاہ انگریزوں کی حمایت میں ایک خاص عہدنامہ کے ذریعہ سے آگئے، بظاہر شاہ عالم نے مسٹر کلائو کو اپنی دیوانی یعنی وزارت کا عہدہ دیا تھا لیکن درحقیقت ہندوستان کی سلطنت اُن کے حوالہ کر دی تھی

اس زمانہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسروں کا کھلم کھلا یہ خیال نہ تھا کہ ہندوستان پر بحیثیت ایک خود مختار بادشاہ کے حکومت کرے، بلکہ اس کے افسر بادشاہ کی آڑ کو سلطنت کا شکار کھیلنے کے لیئے ضروری سمجھتے تھے چنانچہ گورنر جنرل نے کمپنی کی سرکار کو بتاریخ ۱۳ جولائی سنہ ۱۸۰۳ء ایک مراسلہ بھیجا تھا، جسکا مضمون یہ ہے۔

"فرانسیسیوں کو ہندوستان کے شمالی مغربی اضلاع میں قوت و غلبہ حاصل ہوگیا تھا۔ ہمنے شہنشاہ شاہ عالم کو فرانس کے اثر سے چھڑالیا ہے اور فرانسیسی گورنمنٹ اس زبردست آلہ سے محروم ہوگئی ہے جس کی آڑ میں برٹش گورنمنٹ کے خلاف فرانس کو ہندوستان پر قبضہ کرنا مقصود تھا۔ اب ہم بادشاہ اور اس کے خاندان کے لیئے امن و راحت کے ذمہ دار ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی ریاستیں ہم پر اعتماد کرنے لگی ہیں، کیونکہ ہم نے بادشاہ کو مرہٹوں اور فرانسیسیوں

کی قید سے رہائی دلوائی ہے، اور ہم کو ضرورت ہے کہ ہم سب کی نظروں میں بادشاہ کے حامی نظر آئیں۔"

اس مراسلہ سے ظاہر ہے کہ انگریزوں کو فرانس اور مرہٹہ حریفوں کے زیر کرنیکے لیئے مغل بادشاہ کے قائم رکھنے کی بڑی ضرورت تھی، اسواسطے فیصلہ کیا گیا کہ ملکی حکومت سے جو عزت حاصل ہوتی ہے اُسکی ایک خاص مقدار بادشاہ کی ذات کیلئے مقرر رہنی چاہیئے۔ یعنی خاص حدود کے اندر بادشاہ کو عدالت کرنے کے اختیارات دیئے جائیں جنمیں اُن کو زندگی یا موت کے فیصلہ کرنیکا اختیار رہو، بادشاہ اور اُنکے کنبے کو بارہ لاکھ روپیہ سالانہ دیا جائے۔ اگرچہ لوگ کہیں گے کہ وہ شہنشاہ جو دُنیا میں سب سے بڑا تھا تاجروں کی ایک کمپنی کا پنشن خوار ہو گیا ہے تاہم اس سے برٹش گورنمنٹ کو بہت سے فائدے حاصل ہوں گے۔

بادشاہ کو قلعہ دہلی سے نکالنے کی تجویز

یہ سب کچھ تو ہوا لیکن لارڈ ولزلی کی دور اندیش آنکھ دیکھ رہی تھی کہ اگر یہ آبائی سلطنت اسی طرح دوامی رہیگی اور بادشاہ اپنے دادا شاہجہاں کے لال قلعہ میں آباد رہے گا اور اس کے وہ مصاحب جنہوں نے پُرانے اختیارات واقتدارات کے تماشے دیکھے ہیں، اسکے ساتھ رہیں گے تو جاں نثار اور جانباز مسلمانوں کا ایک مرکز اور ہیڈکوارٹر بنا رہے گا، اور کسی نہ کسی دن ایک ایسا وقت آجائے گا کہ اس غارت شدہ سلطنت کو شاہ عالم کے جانشینوں میں سے کوئی شخص دوبارہ بحال کرلیگا۔ اور ہمارا برسوں کا کام چند روز میں خاک کا ڈھیر ہو کر رہ جائے گا۔ اسواسطے انہوں نے یہ تجویز کی کہ بادشاہ اور اُن کا خاندان دہلی کے لال قلعہ میں نہ رہے بلکہ صوبہ بہار کے ضلع مونگیر میں مقیم کیا جائے۔ لیکن جب شاہ عالم کو اس تجویز کی خبر ہوئی تو وہ

تیموری دربار کی آخری جھلک

غضبناک ہوگئے اور انہوں نے تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر کہا "ایسا کبھی نہیں ہو سکتا مجھ میں ابھی زندہ رہنے کی قوت موجود ہے اور زندہ آدمی کو کوئی شخص اپنی پسند کردہ قبر میں دفن نہیں کر سکتا" لارڈ ولزلی نے موقع کی نزاکت کو سمجھا، اور بادشاہ کی خفگی کو اپنے منصوبوں کے لیے خطرناک خیال کیا، کیونکہ فرانسیسیوں اور افغانوں اور مرہٹوں کی سازشوں کے جال انگریزوں کو ہمیشہ خائف رکھتے تھے، اسواسطے لال قلعہ سے نکالنے کی تجویز ملتوی کردی گئی، تاہم بادشاہ اور ان کے خاندان میں انگریزوں کی نیت سے ایک عام بدگمانی پیدا ہوگئی، اور یہ دہلی اور اس کے باشندوں کی اس ناراضی کی پہلی بنیاد تھی جسکا ظہور ۱۱ مئی ۵۷ء میں ہوا۔

اکبر شاہ کی تخت نشینی

۱۸۰۶ء میں شاہ عالم نے انتقال کیا اور اکبر شاہ اُنکی جگہ تخت پر بیٹھے، یہ وقت ایسا تھا کہ قدیمی انگریز ہندوستانی درباروں کی بڑی تعظیم و تکریم کرتے تھے، سیٹن صاحب دہلی کے رزیڈنٹ بادشاہ کے آگے ادنیٰ امیروں کی طرح تسلیم و کورنش و مجرا بجا لاتے تھے، اور شاہی خاندان کے بچہ بچہ کی شاہانہ عزت کرتے تھے، مگر سیٹن صاحب کے نائب چارلس مٹکاف صاحب اپنی نوجوانی اور خصلت ذاتی کے سبب بادشاہ کے اس احترام سے بہت جلتے تھے، اور اُن کا خیال تھا کہ بادشاہ کے احترام کو اسطرح زندہ رکھنا اپنے حق میں کانٹے بونا ہے، چنانچہ انھوں نے اس بارہ میں جو مراسلہ گورنمنٹ کو بھیجا تھا اس کی عبارت یہ ہے:-

"میں اس پالیسی کے ساتھ موافقت نہیں کرتا جو سیٹن صاحب نے خاندانِ شاہی کے ساتھ اختیار کر رکھی ہے، جو شخص برٹش گورنمنٹ کی طرف سے دہلی میں حکمرانی کیلئے مقرر ہو وہ بادشاہ کی تعظیم اسطرح کرتا ہے جس سے بادشاہی

قوت کے بیدار ہونے کا اندیشہ ہے، حالانکہ ہم اس کو ہمیشہ کے لیے سلا دینا چاہتے ہیں، ہمارا یہ مقصود نہیں ہے کہ بادشاہ کو بادشاہی کے دوبارہ اختیار و اقتدار حاصل ہوں، اس لیے ہم کو ایسی حرکتیں نہیں کرنی چاہئیں جس سے اس کے دل میں اپنی بادشاہی حاصل کرنے کی تمنا پیدا ہو اسکا ادب اسکی شان کے موافق کرنا چاہیے۔ اسکو خوش و خرم اور آرام آسائش سے رکھنا چاہیے اگر ہم نہیں چاہتے ہیں کہ اس کی حکومت کو پھر دوبارہ قائم کریں تو ہم کو چاہیے کہ بادشاہی کا خیال اس کے خواب میں بھی نہ آنے دیں۔"

چند سال کے بعد یہی مٹکاف صاحب دہلی کے رزیڈنٹ مقرر ہو گئے اور جب اُن کے ہاتھ میں پوری طرح سے سب اختیارات آ گئے تو اُنھوں نے نہایت ناعاقبت اندیشی سے بادشاہ کی عزت و احترام کے خلاف ایسی ایسی ناشائستہ و نازیبا حرکتیں کرنی شروع کیں جو عقل و انسانیت سے بالکل بعید معلوم ہوتی تھیں جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ اور اُن کے خاندان اور اُن کے امراء اور مذہبی پیشوا اور شہر کے سب باشندے دل ہی دل میں برٹش گورنمنٹ کے خلاف پیچ و تاب کھانے لگے اور ہر شخص کے دل میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ ہم کو کسی صورت سے یہ بوجھ اپنے سر سے اُتار کر پھینکدینا چاہیے۔

اور یہ دوسری بنا ناراضی کی تھی جو ایک انگریز نے اپنی قوم کے خلاف ہندوستانیوں کے دل میں ڈالی اور ارا اُس ۱۸۵۷ء کو اُسکا نتیجہ دیکھا۔

بہادر شاہ کی تخت نشینی

۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء کی شام کو اکبر شاہ بادشاہ نے بیاسی برس کی عمر میں اس جہان سے رحلت کی اور ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ غازی تخت پر بیٹھے۔ بہادر شاہ

تیموری چراغ کی آخری
روشنی۔ جس کے بعد وہ
ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا۔
حکیم احسن اللہ خان
بہادر شاہ
مرزا الٰہی بخش
شہزادہ جواں بخت
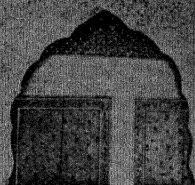
۱۷۷۵ء میں پیدا ہوئے تھے تخت نشینی کے وقت ان کی عمر ۶۰ برس کی تھی، وہ بہت مسکین طبع، صوفی مزاج، خوش بیان شاعر بادشاہ تھے، ان کے باپ نے اپنے دوسرے بیٹے مرزا سلیم عرف مرزا جہانگیر کو ولیعہد بنانے کی کوشش کی تھی، مگر چونکہ مرزا جہانگیر انگریزوں سے بہت نفرت رکھتے تھے اور انھوں نے سیٹن صاحب رزیڈنٹ پر گولی چلا کر قاتلانہ حملہ کیا تھا اور اُن کو لولو کہکر مذاق اُڑایا تھا اس واسطے انگریزوں نے اُن کی ولیعہدی منظور نہ کی اور جلا وطن کر کے الہ آباد بھیجدیا۔ پھر اکبر شاہ نے اپنے دوسرے بیٹے مرزا نیلی کے لیے کوشش کی مگر اس میں بھی ناکامی ہوئی۔ آخر بہادر شاہ کو بادشاہ بنایا گیا۔

جسوقت بہادر شاہ تخت نشین ہوئے لارڈ آکلینڈ ہندوستان کے گورنر جنرل تھے اور سر چارلس مٹکاف لفٹنٹ گورنر تھے۔ یہ وہی مٹکاف تھے جنکی ناعاقبت اندیشی نے بادشاہ اور اُن کے خاندان کو برٹش گورنمنٹ سے ناراض کرانے میں بڑے بڑے کام کیے تھے، بہادر شاہ نے تخت نشین ہو کر سب سے پہلے اپنا وظیفہ بڑھوانے کا مطالبہ کیا، کیونکہ برٹش گورنمنٹ ان کے باپ اکبر شاہ سے اسکا وعدہ کر چکی تھی لیکن مٹکاف صاحب نے اُمید کے موافق اس مطالبہ کی سخت مخالفت کی اور اُنکی مخالفت کے سبب یا کسی اور وجہ سے گورنر جنرل نے بھی گورنمنٹ کے وعدے کو پورا نہ کرنا مناسب خیال کیا اور یہ جواب دیا کہ "بیشک سرکار نے وظیفہ بڑھانیکا وعدہ کیا ہے لیکن وہ جب ہی پورا کیا جائے گا کہ بادشاہ اپنے اُن تمام دعووں سے جو وہ برٹش گورنمنٹ پر رکھتے ہیں باضابطہ دست بردار ہو جائیں" لیکن بہادر شاہ نے جواب دیا کہ "اگر میں باپ کا بیٹا ہوں تو وہی کروں گا جو میرے باپ نے کیا اور برٹش گورنمنٹ کی کسی شرط کو قبول نہ کروں گا"

اس ناکامی سے ایک تیسری بنیاد ناراضی کی بادشاہ اور دہلی والوں کے دلوں میں انگریزوں

کے خلاف پیدا ہو گئی۔
اکبر شاہ مرحوم نے راجہ رام موہن رائے نامور برہمو سماجی کو اپنا سفیر بنا کر لندن بھیجا تھا، وہاں راجہ صاحب کی ذاتی خاطر داری تو بہت ہوئی مگر ان کے حرف مطلب کو ایک انگریز نے بھی آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا اور وہ بیچارے اپنے مقصد میں بالکل ناکام رہے جس کے سبب دہلی کے خاندان شاہی اور عام باشندگان کو اپنے زمانہ آئندہ کی طرف سے طرح طرح کے خطرے پیدا ہونے لگے۔

بادشاہ کی نذر بند کردی گئی

۱۸۳۷ء میں جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے تو حسب دستور کمانڈر انچیف نے بھی ان کے سامنے نذر پیش کی تھی جسطرح کہ عیدین اور نوروز اور بادشاہ کی سالگرہ کے دن گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف کی طرف سے بادشاہ کے روبرو رزیڈنٹ کی معرفت نذریں پیش کی جاتی تھیں۔ مگر لارڈ ایلنبرا نے ان نذروں کو بھی بند کر دیا جس کا بادشاہ اور دہلی والوں کو سخت صدمہ ہوا۔ اسی طرح بات بات میں روزانہ انگریز افسر بادشاہ کی ذلت و توہین کی باتیں کرتے تھے سر چارلس مٹکاف کو بہادر شاہ اپنے خطوں میں فرزند ارجمند لکھا کرتے تھے۔ سر چارلس مرگو اور ہارڈ صاحب ایکنٹ ہو کر دہلی آئے تو اُنھوں نے بادشاہ کو لکھدیا کہ مجھ کو تمہارا فرزند بنا منظور نہیں ہے مجھے فرزند ارجمند نہ لکھنا۔

جارج طامس مسٹر جارج طامس نامی ایک بڑے لائق لکھنے والے اور بولنے والے یورپین کو بہادر شاہ نے نوکر رکھا تھا تاکہ وہ اُنکی طرف سے برٹش گورنمنٹ کے سامنے شاہی مطالبات پیش کرے، مگر مسٹر جارج طامس کی بھی کسی نے نہ سنی اور شاہی خاندان اور باشندگان دہلی نے یہ یقین کرنا شروع کر دیا کہ اب رفتہ رفتہ ہماری روح قبض ہوتی جارہی ہے۔

بادشاہ کی آمدنی

بہادر شاہ کو ایک لاکھ روپیہ ماہوار تنخواہ دی جاتی تھی اور ۱½ لاکھ روپے سالانہ کوٹ قاسم کے علاقہ کا آتا تھا اور شہر کے مکانات کے کرایہ کی بھی کچھ آمدنی تھی۔ اس ایک لاکھ روپیہ ماہوار میں سے ایک ہزار روپیہ مہینہ لکھنؤ بھیجا جاتا تھا جہاں بہادر شاہ کے خاندان کے کچھ لوگ رہتے تھے، اور باقی قلعہ کے کثیر شاہی خاندان میں تقسیم ہو جاتا تھا، اور وہ بادشاہ جس کے بڑے تمام ہندوستان کے خزانوں کے مالک تھے بڑی تنگدستی سے بسر اوقات کرتا تھا۔

ولیعہدی کا جھگڑا

۱۸۳۹ء میں بہادر شاہ کے ولیعہد دارا بخت نے انتقال کیا، اس وقت نئے ولی عہد کے منتخب کرنے کا جھگڑا پیش آیا۔

بادشاہ کو زینت محل بیگم تمام بیگمات سے زیادہ عزیز تھیں، ان کے بیٹے کا نام جواں بخت تھا، چونکہ زینت محل کو بادشاہ کے مزاج میں بہت دخل تھا اور وہ چاہتی تھیں کہ اُن کا بیٹا جواں بخت تخت نشین ہو، اس واسطے بادشاہ بھی جواں بخت کی ولی عہدی کے لئے کوشش کرتے تھے۔

مگر لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل کسی دوسرے ہی خیال میں تھے، اُن کی خواہش یہ تھی کہ کسی طرح دہلی کی بادشاہی کی ظاہری دکھاوٹ بھی ختم کر دی جائے۔ اس لئے انھوں نے یکم اگست ۱۸۴۴ء کو رزیڈنٹ دہلی کے نام ایک حکم بھیجا تھا کہ جب دہلی کا بادشاہ مرجائے تو اس کے جانشین بنانے کے بارے میں ہر معاملہ کی خاص منظوری گورنر جنرل سے لینی چاہیئے، اگرچہ تم (رزیڈنٹ) نے لکھا ہے کہ آئندہ جو شخص تخت نشین ہو اُس کو بادشاہ کے لقب سے محروم کر دیا جائے،

لیکن ہم اس کی موقوفی کا حکم جب تک نہیں دے سکتے کہ اس بارے میں پورے مفصل حالات تم سے نہ سن لیں اور جن باتوں کی تم تحریک کرو اُن کے مقصد اور وجوہ پر ہم فرصت میں غور نہ کر لیں۔"

ولیعہد مرزا دارابخت کا انتقال لارڈ ڈلہوزی کے لئے ایک بہانہ ہوگیا، اور اُنھوں نے پوری سرگرمی سے جانشینی کے مسئلہ میں کام کرنا شروع کیا۔ بہادرشاہ کے ایک لڑکے مرزا فتح الملک عرف مرزا فخرو تیس برس کی عمر کے تھے اور انگریزوں کو بہت پسند کرتے تھے، گورنر جنرل نے اس شہزادہ کو اپنے منصوبوں کے موافق پایا چنانچہ گورنر جنرل نے خفیہ طور پر مرزا فخرو سے ایک عہدنامہ لکھوالیا، جس میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ وہ تخت نشین ہونے کے بعد لال قلعہ میں نہیں رہے گا۔ لیکن جسوقت بہادرشاہ کو اس کی اطلاع ہوئی کہ مرزا فخرو کے جانشین بنائے جانے کی تجویز ہے تو بادشاہ نے اسپر اعتراض کیا، لیکن بادشاہ اوراُن کے خاندان کی مرضی کے خلاف مرزا فخرو ولیعہد مقرر ہوگئے۔

آخر ۱۰ر جولائی ۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو بھی ہیضہ سے انتقال کر گئے تو پھر ولی عہدی کا جھگڑا شروع ہوا، مرزا فخرو کی موت کے دوسرے دن سر طامس مٹکاف ایجنٹ دہلی بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، بادشاہ نے ان کو ایک کاغذ دیا جس میں مرزا جواں بخت کی ولی عہدی کا مطالبہ درج تھا اور اس کے ساتھ ایک محضر بھی تھا جسمیں بہادرشاہ کے آٹھ بیٹوں کے دستخط تھے اور مہریں لگی ہوئی تھیں، اس محضر میں لکھا تھا کہ ہم سب خوش ہیں کہ زینت محل کا بیٹا جواں بخت جس میں دانائی۔ لیاقت علم و خوش اخلاقی کی صفات موجود ہیں ولی عہد مقرر ہو۔ لیکن دوسرے دن بادشاہ کے سب سے بڑے بیٹے مرزا قویاش نے ایک خط رزیڈنٹ کو لکھا کہ بادشاہ نے شہزادوں سے اضافہ تنخواہ کا اور روپیہ دینے کا وعدہ کرکے محضر پر دستخط اور مہریں کرالی ہیں اور میں نے

بھی باپ کے حکم کے موافق اُس پر دستخط کر دئیے تھے، لیکن میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ولی عہدی میرا حق ہے کیونکہ میں بادشاہ کا بڑا بیٹا ہوں حافظ قرآن اور حاجی ہوں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ مرزا قویاش کی یہ درخواست ان کی ذاتی خواہش سے نہ تھی بلکہ خود گورنمنٹ کے کارندوں نے گورنمنٹ کے اشارے سے ان کو اس پر آمادہ کیا تھا۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو گورنر جنرل لارڈ کیننگ کو لارڈ ڈلہوزی کے پُرانے منصوبے کو پورا کرنے کے لئے یہ ایک بہت اچھا ذریعہ مل گیا۔ اس لئے انھوں نے اس درخواست کے جواب میں رزیڈنٹ دہلی کو حسب ذیل مراسلہ بھیجا۔

بادشاہی جاہ و جلال کی نقل کے بہت سے زر و جواہر اتر چکے ہیں جس سے اسکی پہلی سی چمک دمک نہیں رہی ہے، اور اس کے وہ حقوق جن پر خاندان تیمور کو گھمنڈ تھا ایک دوسرے کے بعد تلف ہو چکے ہیں اس لئے کچھ مشکل نہیں ہے کہ قلم کے ایک ڈوبے میں بہادر شاہ کے مرنے کے بعد بادشاہ کا لقب موقوف کر دیا جائے۔ بادشاہ کی نذر جو گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف دیتے تھے، موقوف ہوئی، بادشاہ کا سکہ جو بنایا جاتا تھا وہ بھی بند کر دیا گیا گورنر جنرل کی مہر سے بادشاہ کے فدوی خاص کے الفاظ نکال دیئے گئے اور ہندوستانی رئیسوں کو ممانعت کر دی گئی کہ وہ بھی اپنی مہر و ں میں بادشاہ کی نسبت ایسے الفاظ استعمال نہ کریں، ان تمام امُور کے بعد اب گورنمنٹ نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ظاہر داری کی اب کوئی بات بھی ایسی باقی نہ رکھی جائے جس سے ہماری گورنمنٹ بادشاہ کی ماتحت معلوم ہوتی ہو لہذا بادشاہ دہلی کا لفظ ایسا لقب ہے جسکا باقی رکھنا نہ رکھنا گورنمنٹ کی مرضی پر منحصر ہے"۔

اس کے بعد گورنر جنرل نے اپنے ایجنٹ کو لکھا کہ سرکار مرزا قویاش کی جانشینی کو منظور

کرتی ہے اتم بہادر شاہ سے کہدو کہ گورنر جنرل مرزا جواں بخت کی ولیعہدی کے منظور کرنے سے انکار کرتے ہیں، اور مرزا قویاش سے کہدو کہ تمہاری ولیعہدی میں وہ شرائط نہیں ہوں گی جو مرزا فخرو سے کی گئی تھیں، بلکہ اُن کی صورت دوسری قسم کی ہو گی۔ اُن کو بادشاہ نہیں کہا جائے گا بلکہ شہزادے کے لقب سے پکارے جائیں گے۔ اُن کو قلعہ خالی کرنا ہوگا اور بجائے ایک لاکھ ماہوار کے ۱۵ ہزار روپئے ماہوار دیئے جائیں گے۔

اور سب سے پُر لطف بات مراسلہ گورنمنٹ میں یہ تھی کہ رزیڈنٹ کو حکم دیا گیا تھا کہ مرزا قویاش کے سامنے یہ تمام شرطیں زبانی پیش کی جائیں، تحریر نہ دی جائے۔

جسوقت مرزا قویاش کی ولیعہدی اور ان شرائط کا علم بادشاہ اور اُن کے خاندان کو ہوا تو اُن کے دلوں میں غصہ کی آگ بھڑک اُٹھی اور دہلی کے ہر باشندے کو اس خبر سے ملال ہوا اور لوگوں نے یقین کر لیا کہ برٹش گورنمنٹ رفتہ رفتہ جسطرح ہمارے بادشاہ کے حقوق کو فنا کر رہی ہے اسی طرح رعایا کے حقوق بھی اُسکے ہاں محفوظ نہیں ہیں۔ یہ انتہائی ناراضی کا زمانہ تھا۔ ایکطرف پایۂ تخت میں یہ حالت در پیش تھی اور دوسری طرف تمام ہندوستان میں وہ اسباب بےچینی پیدا کر رہے تھے جنکا ذکر سر سید وغیرہ نے اسباب بغاوت ہند میں کیا ہے، مرزا قویاش کی ولیعہدی ۱۸۵۶ء میں ہوئی تھی اور ۱۸۵۷ء میں غدر ہو گیا۔ گویا جو پھوڑا مدت سے پک رہا تھا وہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو آخر کار پھوٹ نکلا۔

رائے

میں مورخ نہیں ہوں، مورخوں کے خیالات جمع کر رہا ہوں، مگر ان واقعات پڑھنے کے بعد جو ابھی لکھے گئے ہیں ہر شخص آسانی سے رائے دے سکیگا کہ بہادر شاہ

کے ساتھ جو کچھ برتاؤ ہو رہا تھا وہ گلا گھونٹنے کے ہمشکل تھا اور ایسی مایوسی کی حالت میں اگر وہ انگریزوں کی باغی فوج کے شریک حال ہو گئے، تو یہ ایک قدرتی فعل تھا اگرچہ اُن کی شرکت فوج کے دباؤ اور مجبور کرنے سے ہوئی تھی، تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بادشاہ اور اُن کے سب بھولوں کا خیال ہو گیا تھا کہ ہم سب کو سسک سسک کر مرنے سے ایک دفعہ ہی مر جانا چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور مر کر ختم ہو گئے۔

دہلی میں غدر کی شروعات

اس کتاب کے دوسرے، تیسرے اور چوتھے اور پانچویں حصہ میں واقعات غدر کی تفصیل جو دہلی میں پیش آئے پورے طور سے بیان ہو چکی ہے لیکن یہاں بھی سلسلہ بیان قائم رکھنے کے لئے مختصر طور سے ان حالات کو لکھا جاتا ہے جو غدر کی ابتدا میں پیش آئے، یہ میں نے اوپر لکھ دیا ہے کہ غدر کے ان گہرے اور اصلی اسباب کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے جو تمام ہندوستان میں انگریزی فوج میں بغاوت کی آگ بھڑکانے کا باعث ہوئے کیونکہ اُن کو سر سید احمد خان نے ایک مستقل رسالہ "اسباب بغاوت ہند" میں تفصیل کے ساتھ قلمبند کر دیا ہے اور وہ رسالہ علی گڑھ کالج ڈیوٹی شاپ سے آٹھ آنہ کو دستیاب ہو سکتا ہے۔ میں نے تو یہاں صرف دہلی والوں کی بنائے ناراضی لکھنی مناسب جانی، کیونکہ سر سید نے ان باتوں کو اچھی طرح کھول کر نہیں لکھا تھا۔

اب میں

غدر کے حالات

شروع کرتا ہوں، غدر سب سے پہلے میرٹھ چھاؤنی میں شروع ہوا۔ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء اتوار کے دن صبح کے وقت انگریز لوگ گرجا جانے کی تیاریاں کر رہے تھے اور اُن کو بظاہر

کسی بڑے واقعہ کا اندیشہ نہ تھا۔ کارتوسوں کا چربی کا جھگڑا اسباب انگریزوں کو معلوم تھا
اور وہ جانتے تھے کہ فوج بہت برافروختہ ہو رہی ہے، کیونکہ اس سے دو دن پہلے
جب پریڈ کے موقع پر سپاہیوں کو کارتوس دیئے گئے اور کرنیل سمائتھ نے اُن کو
سمجھایا کہ ان میں گائے یا سور کی چربی لگی ہوئی نہیں ہے تم کو یہ غلط خبر دی گئی ہے اگر
تم ان کو دانت سے نہیں کاٹ سکتے تو چٹکی سے توڑ سکتے ہو، یہ وہی کارتوس ہیں
جنکا ۳۰۔۴۰ برس سے رواج چلا آتا ہے، مگر سپاہیوں پر اس تقریر کا کچھ اثر نہیں ہوا
اور اُنھوں نے کارتوسوں کے لینے سے انکار کیا۔ اس پر ۸۵ آدمیوں کو حوالات بھیجا گیا
پھر ۹ مئی ۱۸۵۷ء کی صبح کو یورپین اور ہندوستانی فوج پریڈ میں جمع ہوئی اور انگریز افسر
نے ۸۵ ملزموں کو حوالات سے بُلایا اور اُن کو دس دس برس کی قید کا حکم سُنایا، اُنکی
وردیاں تمام دیسی فوج کے سامنے سرِمیدان اُتاری گئیں اور اُسی جگہ اُن کو بیڑیاں
پہنائی گئیں، اس نظارہ کو تمام دیسی فوج کھڑی ہوئی دیکھتی تھی، اور قیدی پکار پکار کر
اپنے بھائیوں کو غیرت دلاتے تھے کہ جاؤ تم چوڑیاں پہنکر اپنی بیویوں کے پاس بیٹھ جاؤ
ہم پر یہ ظلم ہو رہا ہے اور تم چپ چاپ کھڑے دیکھتے ہو، تم ہندوستانی نہیں ہو، کیونکہ
ہندوستانی اپنے بھائی پر عزت وجان قربان کر دیا کرتا ہے،

باوجود اس ملامت کے دیسی فوج خاموش کھڑی رہی اور اس نے کچھ چون وچرا
نہ کی کیونکہ گوروں کی مسلح فوج وہاں موجود تھی اور وہ بے سروسامانی میں ہتھیار اُٹھانا
مصلحت کے خلاف سمجھتے تھے، تاہم اُن کے چہرے غیرت وغصہ سے لال ہو رہے تھے
اُن کی آنکھیں طیش کے مارے باہر نکلی پڑتی تھیں، اُن کی گردن کی رگیں پھول رہی تھیں
اُن میں سے بعض اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے چباتے تھے اور بعض مونچھوں پر ہاتھ
پھیرتے تھے گویا وہ کہتے تھے کہ ہم تم قیدیوں کا انتقام لیکر رہیں گے۔

جب قیدی پابجولاں وہاں سے روانہ کر دیئے گئے تو فوجی سپاہی بھی اپنی اپنی

بارگوں میں واپس چلے آئے۔ نگران کے تیور بہت بگڑے ہوئے تھے، لارڈ کیننگ نے میرٹھ کے اس واقعہ کی نسبت ایک دفعہ کہا: "پریڈ پر سواروں کے پاؤں میں بیڑیاں ڈالنی جس کے اندر کئی گھنٹے لگے ہوں گے اُن سپاہیوں کے سامنے جو سرکار سے پہلے ہی ناراض تھے اور اُن میں بہت سے ایسے تھے جو کارتوس کی چربی کی کہانی پر یقین کرتے تھے خواہ مخواہ ایک تیز ڈنک لگاتا تھا، اور انگریز افسروں کی ایسی بیوقوفی تھی جو خیال میں بھی نہیں آسکتی۔"

کمانڈر انچیف نے کورٹ مارشل کے فیصلہ کو تو قائم رکھا مگر پریڈ پر بیڑیاں پہنانے کو اُنھوں نے بھی خلاف دستور بتایا۔ اُسی دن شام کو میرٹھ کے بازاروں میں یہ خبریں اُڑ رہی تھیں کہ انگریزوں نے دو ہزار بیڑیاں بنوائی ہیں جو کل کے دن باقی ماندہ سپاہیوں کو پہنائی جائیں گی، اُسی رات کو کھانے کے وقت میرٹھ کے اونچے انگریز افسروں کو اطلاع دی گئی کہ مسلمانوں نے دیواروں کے اوپر اشتہار لگائے ہیں کہ انگریزوں سے جہاد کرنے کا وقت آگیا ہے۔

الغرض باوجود ۹ مئی کے ان واقعات کے ۱۰ مئی کی صبح کو انگریز بالکل مطمئن تھے اور گرجا جانے کی تیاریاں کر رہے تھے، ایک انگریز لکھتا ہے کہ اس روز صبح کے وقت بظاہر تو کچھ ہلچل نہ تھی مگر آسمان کی صورت سے ڈر لگتا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے کوئی بلا نازل ہونے والی ہے، بارگوں کے ہندوستانی نوکر شہر کی طرف بھاگے ہوئے جا رہے تھے، انگریزوں کے ذاتی نوکر بھی نوکری سے غیر حاضر ہوتے جاتے تھے مگر انگریز افسر بھی زیادہ فکرمند نہ تھے، کیونکہ وہ ہندوستانیوں کو بھیڑ کے گیدڑوں کی طرح خاطر میں نہ لاتے تھے، دیسی فوج کی لائنوں میں اور صدر بازار میں ایک بڑی شورش کی علامتیں ظاہر ہو رہی تھیں، یہ چرچا بھی ان کے کانوں تک پہنچا کہ عام طور سے مشہور ہو رہا ہے کہ آج گورے سپاہی سر سے پاؤں تک مسلح ہو کر

کالے سپاہیوں کو ہتھکڑیاں پہنائیں گے۔ بازاروں کو لوٹیں گے، اور شہریوں کا قتل عام کریں گے، غرض تھوڑی دیر کے بعد دیسی فوج کے سوار اور پیدل جیلخانہ کی طرف گئے جن میں کچھ وردی پہنے ہوئے تھے اور کچھ دیسی لباس میں تھے۔ کرچیں اور پستول ان کے ہاتھ میں تھے، انھوں نے جیلخانہ کو توڑ ڈالا اور اپنے فوجی بھائیوں کو قید سے چھڑا لیا۔ اور لوہاروں سے ان کی بیڑیاں کٹوا کر اپنے ساتھ لائن میں لے آئے۔

اُدھر تو انگریز گرجا کی نماز میں تھے اور یہاں قیدی چھڑائے جا رہے تھے۔ مگر فوج نے نہ تو جیلخانہ کے افسروں کو ستایا اور نہ کسی اور انگریز پر ہاتھ اٹھایا، اور نہ وہ گرجا پر حملہ آور ہوئے۔ اگر وہ اسوقت گرجا پر حملہ کر دیتے تو ایک انگریز بھی زندہ سلامت نہ رہتا۔ کیونکہ وہاں سب انگریز بے ہتھیار تھے، گرجا کی نماز کے بعد فوج نے دیکھا کہ گورا فوج پریڈ پر تیار کھڑی ہے۔ اور ان کو یقین ہو گیا کہ یہ لوگ ہمکو قید اور قتل کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں اس لئے انھوں نے اپنی چھاؤنی کے چھپڑوں میں بندوقوں کے فیر کرکے آگ لگا دی، جب انگریز افسروں نے یہ فساد دیکھا تو وہ انتظام کے لئے لائنوں میں دوڑے ہوئے آئے اور سپاہیوں کو دھمکیوں اور خوشامد سے سمجھانے لگے، مگر سپاہیوں پر کچھ اثر نہیں ہوا انھوں نے کہا کہ اب کمپنی کا راج ختم ہو گیا۔ تم ہمارے سامنے سے چلے جاؤ۔ ہم تم کو قتل کرنا نہیں چاہتے۔ مگر ہم کو تمہارا بادشاہ بنانا بھی منظور نہیں ہے، لیکن افسروں نے اپنی قوت سے ان کو دھمکانا چاہا۔ جس سے مشتعل ہو کر بیسویں رجمنٹ کے سپاہیوں نے سب سے پہلے بندوقیں اٹھائیں اور کرنیل فنٹس پر گولیاں چلائی گئیں، یہ پہلا انگریز تھا جو مقتول ہو کر گھوڑے سے گرا۔ اس کے بعد قتل اور لوٹ مار کا بازار خوب گرم ہو گیا۔ علاوہ کرنیل فنٹس کے انھوں نے سات دوسرے افسروں کو اور تین افسروں کے بیوی بچوں کو بھی مار ڈالا۔ انکو جہاں کہیں انگریز مرد۔ عورت۔ یا بچہ نظر آتا تھا وہ اس کو فی الفور قتل کر دیتے تھے۔

وکٹر ہیوگوف لکھتے ہیں کہ ہندوستانی شہروں کے مکانات جنگلوں کے بھٹوں کی طرح ہوتے ہیں، جنکے اندر رہنے والے اگرچہ انسانی شکل رکھتے ہیں لیکن وہ نہایت موذی اور ہیبتناک ہوتے ہیں، اور میرے خیال میں ہندوستانی بھٹوں کے انسانوں سے جنگلی بھٹوں کے حیوان اچھے ہوتے ہیں۔ میرٹھ میں یہی دیکھنے میں آیا کہ شہروں اور دیہات کے بھٹوں سے بیشمار ہندو مسلمان نکلکر آگئے تھے اور انگریزوں کے ساتھ درندوں کا سا کام کر رہے تھے"

قصہ مختصر تمام دیسی فوج بگڑ گئی اور اس نے شام کے وقت دہلی کی طرف کوچ کر دیا، انگریزی فوج ایسی حواس باختہ ہوئی کہ نہ تو اس سے اس بغاوت کا انتظام ہو سکا اور نہ وہ باغیوں کا تعاقب کر سکی۔ نہ اس کو یہ معلوم ہو سکا کہ باغی فوج کدھر گئی حالانکہ میرٹھ میں بہت بڑی جمعیت گورا فوج کی موجود تھی مگر بقول مسٹر ہیوگوف کے میرٹھ کا برگیڈیر جنرل ولسن ایسا سراسیمہ ہو گیا تھا کہ وہ بالکل نہیں سمجھ سکا کہ اُسے کیا کرنا چاہیئے۔ اس نے تمام رات شہر کے چاروں طرف گورا فوج کا محاصرہ رکھا مگر ہندوستانی فوج کو دہلی جانے سے نہ روکا، اگر اس رات باغی دہلی نہ جا سکتے تو غدر کا یہ قصہ اتنا طول نہ پکڑتا۔

۱۱ مئی دہلی کا غدر

منشی ذکاء اللہ صاحب لکھتے ہیں:۔

"۹ مئی ہفتہ کا ذکر ہے کہ مسٹر ایف ٹیلر پرنسپل دہلی کالج نے مولوی سید محمد صاحب مدرس اوّل عربی سے پوچھا کہ شہر کی کیا خبر ہے تو اُنھوں نے کہا کہ میرٹھ میں غدر مچنے کی خبریں مشہور ہو رہی ہیں اور لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ اب انگریزی عملداری کا خاتمہ ہونیوالا ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ دیوانوں کے خیالات ہیں ورنہ آپ کی سرکار کا انتظام ایسا اعلیٰ درجہ کا ہے کہ آپ کی سلطنت میں خلل پڑنے کا کچھ بھی اندیشہ نہیں ہے۔ مولوی صاحب

کی یہ بات سنکر پرنسپل صاحب نے اپنا ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھایا اور کہا کہ سلطنت خدا کی مرضی پر موقوف ہے۔ انسان کے انتظام پر نہیں ہے"

میرٹھ میں انگریزی فوج پریڈ کے میدان میں پڑی سوتی رہی اور تیسرے رسالہ کے ہندوستانی سوار چاندنی رات میں گھوڑوں پر سوار دہلی کی طرف دوڑتے رہے اور کسی جگہ بھی انھوں نے ان کا قدم کو نہ روکا۔ یہانتک کہ صبح نماز کے وقت وہ دہلی پہنچ گئے اور پہنچتے ہی انگریزی بنگلوں اور کوٹھیوں میں آگ لگانی شروع کردی اور جو انگریز ملا اس کو مارڈالا۔ یہانتک کہ عورتوں اور بچوں کے ساتھ بھی نہایت بیرحمی کا سلوک کیا گیا۔

بیدرد ہندوستانی اور ان کے مظالم

اس کتاب میں انگریزی فوج کے مظالم کا تذکرہ زیادہ آئیگا، مگر اس موقع پر یہ اقرار کرنا قرین انصاف ہے کہ ہندوستانی فوج والوں اور دیسی باشندوں نے بھی غدر کے شروع میں سفاکی اور بیرحمی کو حد سے بڑھا دیا تھا، اور ان کے ستم ایسے ہولناک تھے کہ ہر قسم کی سزا ان کے لیئے جائز کہی جاسکتی ہے، انھوں نے بیکس عورتوں کو قتل کیا۔ انھوں نے حاملہ عورتوں کو ذبح کرنے سے دریغ نہ کیا، انھوں نے دودھ پیتے بچوں کو اُچھالا اور سنگین کی نوکوں پر روک کر بے زبان معصوموں کو چھید ڈالا۔ وہ حاملہ عورتوں کے پیٹ میں تلواریں بھونک دیتے تھے، غرض کوئی ظلم وستم ایسا نہ تھا جو ان کے ہاتھ سے انگریزوں اور ان کے بیوی بچوں پر نہ ٹوٹا ہو۔

منشی ذکاء اللہ صاحب نے چشم دید حال لکھا ہے کہ "میں نے ایک میم کو دیکھا جسکے آس پاس باغی سپاہیوں کا محاصرہ تھا، وہ دودھ پیتے بچہ کو گود میں لیئے جاتی تھی، تولیہ سے بچہ کو ڈھک رکھا تھا۔ ساتھ میں ایک خورد سال لڑکا پیدل چلرہا تھا۔ بازار

والے اس میم کو ننگی تلواریں دکھا دکھا کر قتل کے اشارے کرتے تھے، تلواریں دیکھ کر وہ بچہ ماں کو جمپٹ جاتا تھا اور وہ بیچاری بھی سہم کر کھڑی ہو جاتی تھی، یہانتک کہ اس کو قلعہ میں لے گئے۔

لال قلعہ کے اندر جو انگریز اور عورتیں اور بچے قتل ہوئے وہ بھی نہایت سخت واقعہ تھا، کوئی قوم مذہبی یا ملکی معاملات کے لیئے عورتوں اور بچوں کو قتل نہیں کرتی اگرچہ بہادر شاہ عورتوں اور بچّوں کے قتل سے بہت ناراض تھا اور انہوں نے آخر تک اس کی اجازت نہ دی کہ ان عورتوں اور بچوں کو قتل کیا جائے جو قلعہ میں تھے تاہم ان مظلوموں کو ہلاک کرنے والے بھی ہندوستانی تھے جنہوں نے اپنے رحم دل ملک کے نام کو بٹہ لگا دیا۔ ان کے شرمناک فعال نے تمام ہندوستان کو ہمیشہ کے لیئے رحم و انصاف کی نظروں میں ذلیل کر دیا۔

اگرچہ انگریزی فوج کی زیادتیاں بھی اس لیئے غیر منصفانہ تھیں کہ انہوں نے بے قصور لوگوں کو بھی پھانسی پر لٹکایا یعنی جن لوگوں نے ان کی عورتوں پر ظلم کیئے تھے اُن کے علاوہ بھی بہت سے بے گناہ بغیر کسی تحقیق کے قتل کر دئے گئے اور دوسری قسم کی بے احتیاطیاں بھی بکثرت ہوئیں جنکا ذکر آگے آئے گا، تاہم میرا سر شرم و ندامت سے اونچا نہیں ہوتا جب میں اپنی قوم کی اس دردناک سفّاکی کا حال پڑھتا ہوں جو اُس نے دہلی شہر کے اندر ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء اور اس کے بعد کے زمانہ میں روا رکھی۔

جب میرٹھ سے بغاوت کر کے سوار اور پیدل دہلی کی طرف روانہ ہوئے تو تمام راستہ انکو فکر رہا کہ پیچھے سے انگریزی لشکر آتا ہوگا اس لیئے وہ مڑ مڑ کر دیکھتے جاتے تھے، مگر انگریز تو میدان پریڈ میں پڑے سوتے تھے، باغی دریا کے کنارے پہنچے تو ہندو سپاہیوں نے "جمنا مائی کی جے" کا نعرہ لگایا۔

کمشنر دہلی کی غفلت

مسٹر سائمن فریزر جنکی شہرت آج تک دہلی کے دیہات میں ہی غدر سے پہلی دہلی کے کمشنر تھے، ان کی نسبت دہلی میں عام طور پر مشہور تھا اور ہے کہ انکی نیند نے غدر کی آگ بھڑکائی، اگر وہ نیند کے شوقین نہ ہوتے تو دہلی کا انتظام ہو جاتا اور باغی شہر کے اندر نہ آنے پاتے

وہ شہرت یہ ہے کہ جس وقت میرٹھ میں غدر شروع ہوا وہاں کے افسروں نے بہت روپیہ خرچ کر کے چند ہندوستانیوں کے ہاتھ کمشنر فریزر صاحب کو خط بھیجا تھا کہ یہاں غدر ہو گیا ہے، ممکن ہے کہ باغی دہلی آئیں اس لئے تم وہاں کا بندوبست کرو۔ یہ خط آدھی رات کے قریب دہلی میں کمشنر صاحب کی کوٹھی پر پہنچا۔ صاحب سو گئے تھے (میری والدہ نے مجھ سے کہا کہ غدر میں مشہور ہوا تھا کہ صاحب نے شراب بہت پی تھی) نوکروں نے جگایا اور خط دیا۔ صاحب نے خط جیب میں ڈال لیا اور پھر سو گئے، خط کھولکر نہ پڑھا۔ اور جب خط لانیوالوں نے صاحب کے نوکروں سے کہا کہ معاملہ بہت نازک ہے صاحب کو جگاؤ اور کہو کہ خط پڑھ لیں، تو نوکروں نے کہا ہم صاحب کو جگاتے ہوئے ڈرتے ہیں وہ بہت تیز مزاج ہیں۔ چنانچہ کمشنر صاحب کو کسی نے جگانے کی جرأت نہ کی اور صبح تک وہ سوتے رہے اور صبح بیدار ہو کر جب انہوں نے خط پڑھا تو اسوقت بندوبست شروع کیا مگر باغی شہر میں داخل ہو چکے تھے۔

منشی ذکاء اللہ صاحب کا بیان ہے کہ "خط آنے کی شہرت تو دہلی میں بیشک تھی مگر یہ واقعہ تحقیقات سرکاری سے ثابت نہیں ہوا"

ثابت کیونکر ہوتا۔ صاحب تو ۱۱ رمئی کو قتل ہو گئے تھے، خط بھیجنے والوں نے بھی بات کو

دبانے کی کوشش ہوگی تاکہ مرنے والے پر غفلت کا الزام نہ لگ سکے، ورنہ صاحب کے گھر کا واقعہ خواہ مخواہ مشہور نہ ہوتا، اور ہندوستانیوں کو ایسی غلط بات مشہور کرنے کی کچھ ضرورت بھی نہ تھی،

بہرحال اگر خط کا واقعہ سچا ہے تو کمشنر صاحب کی غفلت نے بڑا نقصان پہنچایا اور بعد میں جسقدر خوفناک کشت و خون ہوئے اُن سب کی ذمہ داری فریزر صاحب کی نیند پر ہے اور میرٹھ میں اسکا بوجھ گورہ فوج پر ہے جس نے باغیوں کا تعاقب نہ کیا اور پریڈ کے میدان میں بیٹھے سوتے رہے۔ یہ دونوں ہوشیار ہوتے تو غدر کی روک تھام شروع ہی میں آسانی سے ہو جاتی،

منشی ذکاءاللہ صاحب نے لکھا ہے: " میں نے خود دیکھا کہ سامنے فریزر صاحب کمشنر دہلی دو گھوڑوں کی بگھی میں سوار ہیں اور اُن کے پیچھے اردلی میں جھجھر کے سوار چلے جاتے ہیں، کمشنر صاحب نے اپنی بگھی کو میگزین کے پاس تھمایا، وہاں تلنگوں کی کمپنی وردی پہنے کھڑی تھی، اس کے صوبہ دار کو کمشنر صاحب نے بلا کر کچھ باتیں کیں جو میں نے نہیں سُنیں، مگر لوگوں نے جب صوبہ دار سے پوچھا کہ کیا باتیں ہوئیں تو اُس نے کہا کہ صاحب کمشنر پوچھتے تھے کہ ہمارا ساتھ دوگے یا نہیں؟ ہمنے کہدیا کہ ہم اپنے دھرم کے ساتھی ہیں، ان تلنگوں نے کمشنر صاحب کی سلامی بھی دستور کے موافق نہیں اُتاری، کمشنر صاحب نے اپنی سواری آگے بڑھائی، ان کی بگھی کے گرد آدمیوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی جب میں آگے قلعہ کے نیچے لال ڈگی کی سڑک پر آیا تو میں نے دیکھا کہ سڑک پر مسٹر ہچنسن مجسٹریٹ دہلی گھوڑا دوڑائے چلے آتے ہیں اور اُن کے پیچھے دو اردلی کے سوار اور شرف الحق کوتوال بھی ساتھ ہیں، پھر تھوڑی دیر کے بعد آٹھ سات ترک سوار خونخوار گھوڑے دوڑاتے ہوئے دکھائے دئے جنکو دیکھکر میں اپنے گھر چلا آیا۔"

فریزر صاحب نے کلکتہ دروازہ کو بند کرا دیا تھا۔ باغیوں نے جب اس کو بند دیکھا تو

وہ دریا کے کنارے جھروکوں میں قلعہ کے مثمن برج کے نیچے گئے اور بادشاہ کی دوہائی دیکر کہا "ہم کو اپنے مذہب کے لئے لڑنے کے واسطے بادشاہ کی امداد درکار ہے، بادشاہی ہمارے دین دنیا کے محافظ ہیں" مگر بادشاہ نے اُن کی دہائی کا کچھ جواب نہیں دیا، اور نہ اُن کے سامنے آئے۔ البتہ بادشاہ نے حکیم احسن اللہ خاں اور غلام عباس شمشیر الدولہ کو بلایا اور غلام عباس کو حکم دیا کہ کپتان ڈگلس صاحب قلعہ دار کے پاس جاکر سواروں کے آنے کی خبر دیدو۔ غلام عباس تھوڑی دیر کے بعد کپتان ڈگلس کو اپنے ساتھ قلعہ میں لے آئے۔ کپتان صاحب فوراً برآمدہ میں آئے اور زیر جھروکہ جو سوار کھڑے تھے اُن سے کہا کہ یہ بادشاہ کی خوابگاہ ہے تم اپنی داد فریاد سے بادشاہ کو تکلیف نہ دو یہ تمہاری فریاد سننے کی جگہ نہیں ہے، کوٹلے کی طرف جاؤ وہاں جو عرض کرنا ہے کرو، شنوائی ہوگی، سوار راج گھاٹ کی طرف چلے گئے، بادشاہ کپتان صاحب کے آنے کی خبر سنکر دیوان خاص کے کھلے صحن میں نکل آئے تو کپتان ڈگلس نے اُن سے کہا کہ حضور گھبرائیں نہیں، یہ شور و شر فوراً رفع کر دیا جائے گا۔

باغی سوار راج گھاٹ کے دروازہ کی طرف آئے، یہ دروازہ بھی فریزر صاحب نے بند کرادیا تھا، مگر جونہی سوار وہاں پہنچے دروزہ خود بخود کھل گیا۔ دروازہ کھلنے کی نسبت عجیب و غریب شہرتیں دہلی میں ہوئی تھیں، کوئی کہتا تھا کہ ایک سبز پوش سوار آسمان سے اترا اور اُس نے دروازہ کھولدیا، کوئی کہتا تھا پہرے کے سپاہی باغیوں سے مل گئے۔ بہرحال دروازہ کھلا ہوا دیکھکر باغی شہر کے اندر گھسے اور انگریزوں کو قتل کرنا شروع کیا۔ جب سوار شہر میں داخل ہوئے تو "دین دین" کے نعرے لگاتے جاتے تھے اور دین دین کی آوازیں سنکر مسلمان باشندوں کی بھیڑ اُن کے ساتھ جمع ہوتی جاتی تھی، ہندو باشندے بھی سواروں کو اولوں اور بتاشوں کا شربت لیٹوں میں جگہ جگہ پلا رہے تھے۔

کمشنر صاحب ۔ کپتان ڈگلس ۔ سر طامس مٹکاف ۔ ہچنسن صاحب وغیرہ انگریز کوتوالی میں جمع ہوئے ۔ جہاں اور انگریز بھی موجود تھے ۔ سواروں اور باغی شہریوں نے کوتوالی کو گھیر رکھا تھا۔ اسوقت فریزر صاحب نے ایک سوار کے گولی ماری جو صاحب کی طرف آگے بڑھا چلا آرہا تھا۔ سوار مرکر گر پڑا ۔ اور اس کے ساتھی سوار ذرا پیچھے ہٹے لیکن شہری باشندوں نے بندوقوں کی کچھ پروا نہ کی اور نعرے مار کر انگریزوں پر حملہ کر دیا ۔ یہ دیکھکر سب انگریز بھاگے ۔ قصہ مختصر اپنی قیام گاہ پر پہنچتے پہنچتے مسٹر فریزر ۔ مسٹر ڈگلس اور مسٹر ہچنسن تینوں مارے گئے ۔

ایک ہندوستانی کی وفاداری

منشی ذکاء اللہ صاحب کہتے ہیں کہ مجھ سے رائے شنکر داس وکیل عدالت ججی نے بیان کیا کہ بلوہ کی خبر سنکر سمتھ صاحب سشن جج نے کچہری برخاست کر دی اور گھوڑے پر سوار ہو کر ہنگامہ کی طرف چلے تو ایک بوڑھے درزی نے جو صاحب کا پرانا ملازم تھا ان کے گھوڑے کی باگ موڑ کر کہا کہ صاحب مرنے کو کہاں جاتے ہو، اور اصرار کر کے اُن کو آگے نہ جانے دیا۔"

کپتان ڈگلس کے مکان میں دو نوجوان عورتیں بھی تھیں وہ بھی باغیوں کے ہاتھ سے ماری گئیں ، دہلی بینک لوٹا گیا ۔ اسکا یورپین منیجر مارا گیا ۔ دہلی گزٹ پریس کے عیسائی ملازم قتل کر دیئے گئے ، غرض کہ شہر میں بظاہر حالات انگریزوں اور اُن کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور چھاؤنی میں بھی بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی ۔ اور انگریزوں کو دہلی سے بھاگ جانے کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا ۔ باقی حالات غدر دہلی کے افسانے حصہ دوئم " انگریزوں کی بپتا" اور حصہ چہارم بہادر شاہ کے مقدمہ اور حصہ پنجم میں مفصل شائع ہو چکے ہیں ۔ اب اُن کے دوہرانے کی ضرورت نہیں ۔ حاصل مقصد یہ ہے کہ جہاں جہاں بغاوت ہوتی تھی ہندوستانی فوجیں سیدھی دہلی کی

کی طرف آتی تھیں، اور یہاں سب باغیوں کا مجمع ہوتا جاتا تھا، اور بہادر شاہ کے
لڑکوں میرزا مغل و میرزا خضر سلطان وغیرہ نے انکی افسری قبول کرلی تھی۔

انگریز بھی باوجود پریشاں حالی اور چاروں طرف کی بغاوتوں کے پنجاب کے
سکھوں، نیپال کے گورکھوں اور پنجابی سلمانوں کو سمیٹ کر پہاڑی کے مورچے پر
آگئے تھے اور دہلی فتح کرنے کو سب سے بڑا کام سمجھتے تھے، کہ دہلی ہی کے اوپر تمام
شورشوں کے بڑھنے اور گھٹنے کا مدار تھا۔

لہذا اب دہلی کے باغیوں اور انگریزوں کی لڑائی کے آخری انجام کا ذکر کیا جاتا
ہے جو دہلی کی فصیل کے سامنے کئی مہینے ہوتی رہی تھی۔

دہلی پر حملہ کی تیاریاں

ستمبر ۱۸۵۷ء کے شروع میں انگریزوں نے باہمی مشورہ سے طے کرلیا تھا کہ جس
طرح بھی ممکن ہو دہلی کو فتح کرلینا چاہیئے، اس لیئے انجنیر اور قلی اور سب سپاہی بڑے
زور شور کی تیاریاں کر رہے تھے۔ پہلے اُنہوں نے سمی ہاوس کے بائیں طرف
ایک مورچہ بنایا، جس پر چھ توپیں لگائیں تاکہ لاہوری اور کابلی دروازے سے آنے
والے دشمنوں کے حملے روکے جائیں اور موری دروازہ کے گڑگچ سے جو دھواں دھار
توپیں چلتی ہیں وہ بھی بند ہو جائیں، اس کے علاوہ اس مورچہ میں ایک یہ چال بھی
تھی کہ حریف یہ سمجھنے لگے کہ انگریز اس طرف سے حملہ کریں گے اور جب وہ اس مورچہ
کی طرف متوجہ ہو تو دوسری طرف سے حملہ کر دیا جائے۔

۶ ستمبر کو تمام سپاہ جو کمک کے لیئے آسکتی تھی آگئی تھی، جن میں ۶ ہزار ۵۰۰ پیدل
تھے اور ایک ہزار سوار اور ۶۰۰ توپچی۔ اس فوج میں گورے سپاہی صرف
تین ہزار تین سو سترہ (۳۳۱۷) تھے، دیسی فوج میں سکھ۔ گورکھے اور پنجابی مسلمان

تھے، اور قلی بھی کثیر تعداد میں تھے، انجنیئروں نے خندق بھرنے کے لیئے دس ہزار لکڑیوں کے گٹھے اور بالو ریت سے بھرے ہوئے ایک لاکھ تھیلے بیشمار توڑے اور زینے تیار کر لیئے تھے،

۷ ستمبر کی شام کو جب رات کی تاریکی پھیل گئی تو یہ سامان اونٹوں اور قلیوں کے ذریعہ سے فصیل شہر کی طرف روانہ کیا گیا، خیال یہ تھا کہ صبح تک سب سامان فصیل تک پہنچ جائیگا، مگر بدقسمتی سے چاند نکل آیا اور اس کی روشنی میں دشمن نے انگریزوں کے سامان کو آتے ہوئے دیکھ لیا، بس دیکھنے کی دیر تھی کہ موری دروازہ کے گرگج نے توپوں کے ایسے گراب مارنے شروع کیئے کہ قلی اور اونٹ اور اکثر سامان چھترں کی طرح اڑ گیا۔ لیکن نقصان زیادہ تر آگے بڑھنے والوں کا ہوا تھا پچھلا حصّہ ایک حد تک محفوظ تھا، باغیوں نے سامنے کا میدان صاف کر کے خیال کیا کہ اب حملہ آوروں میں کوئی بھی باقی نہیں رہا ہے اس واسطے گولہ باری بند کر دی اور انگریزی فوج کو ذرا دم لینے کی فرصت ملی۔

دوسرے دن صبح انگریزی توپخانہ نے گولہ باری شروع کی جو اس زور کی تھی کہ دوپہر تک موری دروازہ کا گرگج مسمار ہو گیا، اور شہر کی فصیل میں بھی بہت سے سوراخ پڑ گئے مگر باغیوں کی گولہ باری سے انگریزوں کا بھی بہت نقصان ہوا، اور میجر کے صاحب کے مورچہ میں جو کشمیری دروازہ کے گرگج پر گولہ باری کر رہے تھے آگ لگ گئی جسکو بمشکل بجھا سکا۔ ۸ ستمبر کو انگریزوں نے لڈلو کیسل فتح کر لیا جو کشمیری دروازہ سے ۵۰۰ گز کے فاصلہ پر تھا اور جہاں کشمیری دروازہ سے نکل نکل کر باغی دھاوے کیا کرتے تھے، جنگی لحاظ سے یہ مقام بہت اہم تھا۔ دسویں ستمبر کو قدسیہ باغ میں ایک مورچہ تیار کیا گیا اور اسی دن کپتان ٹیلر نے دریائی گرگج سے ایک سو ساٹھ گز کے فاصلہ پر کسٹم کی کوٹھی میں مورچہ بنایا جو نہایت ہی کامیاب مورچہ ثابت ہوا۔ اور

معلوم نہیں کہ باغیوں نے اس مورچہ کا اب تک کیوں خیال نہیں کیا تھا جب یہ مورچے بنائے جا رہے تھے تو باغیوں نے توپوں اور بندوقوں سے انگریزوں کا بہت نقصان کیا۔ ۱۱ ستمبر کی صبح کو دونوں طرف سے اس زور شور سے گولہ باری ہوئی کہ زمین آسمان لرزنے لگے، کشمیری دروازہ کے گرگج کو اگرچہ خاموش ہونا پڑا۔ لیکن باغی تدبیروں کی جنگ میں کمزور ثابت نہیں ہوئے۔ انہوں نے فصیلوں میں سوراخ کیئے اور اس طرح سے توپیں وہاں لیجا کر لگائیں کہ انگریزوں کی ہر توپ کے مقابلہ میں ان کی ایک توپ قائم ہوگئی اور پھر اس غضب کی گولہ باری کی کہ انگریزوں کے چھکے چھڑا دئے۔ انگریزی لشکر کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جس کو باغیوں کے گولوں اور گولیوں سے نقصان نہ پہنچا ہو۔ تین سو انتالیس (۳۳۹) آدمی تو بالکل جان سے مر گئے اور زخمیوں کا تو کچھ حساب نہیں۔

۱۳ ستمبر کی رات کو میڈنی صاحب اور لینگ صاحب فوجی انجنیئروں کو حکم دیا گیا کہ کشمیری دروازہ کے گرگج اور دریائی گرگج کی خبریں لائیں اور دیکھیں کہ فصیل میں جو شگاف پڑ گئے ہیں وہ فوج کے اندر گھس جانے کے قابل ہیں یا نہیں یہ دونوں دشمنوں کی آنکھ بچا کر خندق کے کنارے پر پہنچے، اور اس کے اندر اتر گئے اور چاہتے تھے کہ شگاف کے اوپر پہنچیں کہ انہوں نے کسی کے آنے کی آہٹ سنی اس لئے یہ دونوں جلدی سے اُلٹے پھرے اور وہیں خندق میں چپکے سے گھاس کے اوپر لیٹ گئے، چاندنی خوب کھلی ہوئی تھی، انگریزوں نے دیکھا چند شکلیں شگاف کے سر پر نمودار ہوئیں، وہ آپس میں چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے اور آواز آتی تھی کہ وہ گزوں سے بندوقوں کو بھر رہے ہیں، یہ دونوں انگریز کئی گھنٹے وہاں لیٹے رہے اور لیٹے لیٹے انہوں نے معلوم کر لیا کہ شگاف بہت کافی ہیں، لیکن جونہی انہوں نے خندق سے باہر جانا چاہا باغیوں نے ان کے گولیاں مارنی شروع کیں مگر انگریزوں

کی زندگی باقی تھی، گولیاں سنناتی ہوئی ان کے کانوں کے پاس سے گزر گئیں۔ مگر کسی کے لگی نہیں، اس کے بعد میڈنی صاحب نے رپورٹ بھیجی کہ فصیل میں دراڑیں کافی ہیں، اس پر ہوم صاحب اور گریٹ ہیڈ صاحب نے احکام جاری کئے کہ ۱۴ ستمبر کی صبح کو دہلی پر حملہ کیا جائے گا۔

حملہ کرنے والی فوج کے پانچ کالم بنائے گئے، پہلے کالم کا سردار جنرل نکلسن کو مقرر کیا گیا۔ ان پانچ کالموں میں پانچ ہزار مضبوط سپاہی تھے۔ کیمپ کی حفاظت کے لئے بیماروں اور زخمیوں کو مقرر کیا گیا تھا۔ جاسوسی کے افسر میجر ہڈسن تھے جنکے پاس شہر کی چھوٹی سے چھوٹی بات تک کی خبریں آتی تھیں، اور شاہی خاندان کے آدمی بھی خبریں بھیجتے تھے، جاسوسی کے میر منشی رجب علی نامی تھے جنکے کاموں پر انگریزوں کو بہت بھروسہ تھا، اور قلعہ میں میرزا الٰہی بخش بادشاہ کے سمدھی منشی رجب علی کے ذریعہ خبریں بھیجتے تھے۔

۱۴ ستمبر دہلی کی ہار

انگریزوں کا ارادہ یہ تھا کہ بہت سویرے دہلی پر یورش کی جائے، لیکن سپاہی چونکہ رات بھر بکٹوں میں جاگے تھے اس واسطے ان کے آنے میں دیر لگی پہلے ساٹھویں رائفل رجمنٹ غل شور مچاتی ہوئی آگے بڑھی اور اسی وقت قدسیہ باغ سے جنرل نکلسن نے بھی اپنی فوج کو آگے بڑھایا اور شہر پناہ کے شگافوں کی طرف چلنا شروع کیا۔ باغیوں نے یہ دیکھ کر اس زور سے گولے اور گولیوں کا مینہ برسانا شروع کیا کہ انگریزی فوج حواس باختہ ہوگئی، اور بہت لوگ مارے گئے۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد زینے آگئے اور جو لوگ فصیل کے قریب پہنچ گئے تھے انہوں نے زینے فصیل پر پہنچا دئے اور سب سے پہلے جو شخص اس

فصیل پر چڑھا وہ جنرل نکلسن تھا۔ اور بھی دو چار انگریز اور دیسی لوگ زینوں پر چڑھ گئے مگر وہ زخمی ہوئے یا مارے گئے، یا اُن کو واپس ہونا پڑا فصیل کے نیچے اس کثرت سے آدمی مارے گئے کہ شگاف مُردوں سے بھر گئے۔

پرمٹ کی کوٹھی کی طرف سے جس فوج نے حملہ کیا تھا اس کا بھی بہت نقصان ہوا، مگر اس کے باوجود وہ شہر کے اندر داخل ہو گئی۔ کشمیری دروازہ کے قریب انگریزی فوج نے ایک کھڑکی کو بارود سے اُڑا دیا، اور اُس کے اندر سے فوج شہر میں داخل ہو گئی، تو انھوں نے جا کر یہ دیکھا کہ وہاں صرف ایک توپ لگی ہوئی تھی، اور اُس کے پاس دو تین باغی تلنگوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ دریائی گڑھ کی فوج اور کشمیری دروازہ کی فوج گرجا کے میدان میں آپس میں جا کر مل گئی اور یہاں پہنچکر وہ ٹھہر گئی آگے نہ بڑھی،

چوتھا کالم سبزی منڈی سے کشن گنج اور پہاڑ گنج کی طرف حملہ آور ہوا تھا مگر حملہ کے شروع ہوتے ہی ریڈ صاحب جو اس کالم کے افسر تھے سخت زخمی ہو گئے اور دوسرے بہت سے افسر بھی مارے گئے اور زخمی ہوئے۔ آخر بہت زیادہ نقصان اُٹھانے کے بعد یہ کالم بھاگا اور ہندوراؤ کے باڑے کی طرف چلا گیا۔ وہاں اس کو عیدگاہ کی طرف سے بھاگی ہوئی کشمیری کنٹجنٹ کی فوج ملی جس سے باغیوں نے ۴ توپیں چھین لی تھیں اور مار مار کر بھُرکس نکال دیا تھا۔

نکلسن صاحب کے حکم سے فوج کا ایک حصّہ اجمیری دروازہ کی طرف گیا اور ایک حصّہ کو کابلی دروازے کے رُخ سے جامع مسجد تک جانے کا حکم ملا۔ کابلی دروازہ پر انگریزی جھنڈا گاڑ دیا گیا، مگر باغیوں نے ایسا سخت مقابلہ کیا کہ اجمیری دروازہ وغیرہ کی فوج بھاگ کر کابلی دروازہ کے پاس آ گئی اور برن گڑھ باغیوں نے پھر فتح کر لیا، یہ دیکھ کر نکلسن صاحب نے برن گڑھ پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لئے

نہایت سخت حملہ کیا۔ مگر جونہی آگے بڑھے میجر جیکب کے گولی لگی، اور دوسرے بھی بہت سے افسر مارے گئے، فوج نے افسران کو مرتے ہوئے دیکھا تو اسکے پاؤں لڑکھڑائے اور بھاگنا چاہا مگر نکلسن جلادو ڑکر آگے گئے، اور سپاہیوں سے کہا بھاگو مت میرے پیچھے آؤ، یہ کہکر فوج کو ساتھ لیا اور آگے بڑھے، مگر فوراً اُن کی چھاتی میں بھی گولی لگی اور وہ گر پڑے، آخر فوج بھاگ کر کابلی دروازہ کی طرف چلی گئی۔

جامع مسجد کی لڑائی

فوج کا ایک حصہ سر طامس مٹکاف صاحب کے ماتحت تہا، وہ شہر کے حال سے خوب واقف تھے کیونکہ دہلی کے کلکٹر و مجسٹریٹ رہ چکے تھے، اس لیئے وہ اپنی فوج کو ایسے راستوں سے لے گئے جہاں دشمنوں کی آتشباری بہت کم تھی، وہ جامع مسجد تک پہنچ گئے، اور جہاں آج کل ڈفرن ہسپتال ہے وہاں کھڑے ہو کر کمک کا انتظار کرنے لگے، اُن کو خیال تھا کہ اجمیری دروازہ کابلی دروازہ اور سبزی منڈی کی فوجیں حسب وعدہ یہاں پہنچ جائیں گی، اُنہوں نے آدھ گھنٹہ ٹھہر کر انتظار کیا، جامع مسجد میں اُس وقت ہزار ہا مسلمان نماز کے لیئے جمع تھے، اُن کو معلوم ہوا کہ انگریز مسجد کو بارود سے اُڑانا چاہتے ہیں، ان سب کے پاس تلواریں تھیں، بندوقیں نہ تھیں اُنکا ایک آدمی ممبر پر چڑھا اور اُس نے مسلمانوں سے پکار کر کہا "تمہارے امتحان کا وقت آگیا ہے، انگریزوں کا مقابلہ اپنی باغی فوج سے تھا مگر اب وہ تمہاری مسجد کو ڈہانے آئے ہیں، میں تم کو مرنے کا بلاوا دیتا ہوں، تم میں سے کون کون جان دینی چاہتا ہے دشمن سامنے کھڑا ہے، جس کو مرنا ہو وہ میرے ساتھ شمالی دروازہ کی طرف آئے اور جسکو جان پیاری ہو وہ جنوبی دروازہ کی طرف چلا جائے کہ اُدہر دشمن کی فوج نہیں ہے" یہ تقریر سنکر مسلمانوں نے تکبیر کا نعرہ بلند کیا اور اُن میں سے ایک آدمی بھی جنوبی

دروازہ کی طرف نہیں گیا، ان سب نے تلواریں میانوں سے کھینچ لیں اور سب سے پہلے میانوں کو کاٹ کر پھینکدیا گیا، گویا اُنھوں نے یہ ارادہ کر لیا کہ اب ہماری تلواریں میان میں نہیں جائیں گی، اُنھوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا جس کی گونج سے مسجد کے در و دیوار ہل گئے، اس کے بعد وہ شمالی دروازہ کی طرف دوڑے، جونہی دروازہ کے باہر آئے مٹکاف صاحب نے بندوقوں کی ایک باڑھ ماری جس سے دو سو آدمی شہید ہو کر گر پڑے اور مسجد کی سیڑھیاں اُن کی لاشوں سے بھر گئیں، مگر مسلمان اس پھرتی سے دوڑے کہ دوسرا گراب مارنیکی فرصت مٹکاف صاحب کو نہ ملی، اور تلواروں کی دست بدست لڑائی ہونے لگی، مٹکاف صاحب ان پُر جوش آدمیوں کا مقابلہ نہ کر سکے اور اُن کو یہ مناسب معلوم ہوا کہ سامنے سے ہٹ جائیں، چنانچہ وہ اور انکی فوج وہاں سے بھاگی، اور کشمیری دروازہ کے گرجا تک مسلمان انکا تعاقب کرتے رہے لیکن جب مسلمانوں نے یہ دیکھا کہ گرجا کے قریب انگریزوں کی اور بہت سی فوج موجود ہے تو وہ سب واپس چلے آئے۔

حواس باختہ جنرل

کیمبل صاحب جو اس لڑائی میں زخمی ہو گئے تھے کہتے ہیں کہ اگر مجکو کمک پہنچ جاتی اور بارود کے چھکڑے میرے پاس آجاتے تو میں جامع مسجد دہلی کو اُس دن ضرور اُڑا دیتا

لارڈ رابرٹس اپنی تاریخ چہل و یک سالہ میں لکھتے ہیں کہ " اُس روز میں جنرل ولسن کیساتھ تھا، جنرل لڈلو کیسل کی چھت پر کھڑے ہوئے لڑائی کا رنگ دیکھ رہے تھے، جب اُنھوں نے اپنی فوج کی فتحیابی کے آثار دیکھے تو وہ گھوڑے پر سوار ہو کر کشمیر دروازہ سے گرجا تک آئے، اور دن بھر وہیں رہے، وہ بہت تھکے ہوئے تھے اور بیمار بھی تھے، جب دن ختم ہونے کو ہوا تو اُن کے پاس ایسی بُری بُری خبریں

آئیں کہ وہ گھبرا گئے، اور اُن کا دل مایوسی سے بجھنے لگا، انہوں نے سُنا کہ ریڈ صاحب کو شکست ہوئی، اور وہ خود بھی سخت زخمی ہوئے، پھر یہ خبر آئی کہ جنرل نکلسن بھی بہت سخت زخمی ہوئے ہیں، پھر خبر آئی کہ ٹومبس اور ہوپ گرینٹ بھی مارے گئے۔ ان سب خبروں کو سُنکر جنرل ولسن ایسا سراسیمہ و پراگندہ خاطر ہوا کہ وہ یہ سوچنے لگا کہ مصلحت یہ ہے کہ شہر چھوڑ کر پھر اُلٹے پہاڑی پر چلے جائیں اُس نے مجھے حکم دیا کہ یہ جو رپورٹیں آئی ہیں ان کی حقیقتِ حال دریافت کرو اور کالم نمبر ۴ کی خبر لاؤ، کہ اُسپر کیا گزری؟ میں یہ پیغام لیکر گھوڑے پر سوار ہوا۔ اور کشمیری دروازہ میں آیا تو میں نے سڑک کے ایک طرف ایک ڈولی رکھی ہوئی دیکھی جس کے ساتھ کہار نہ تھے میں گھوڑے سے اُترا اور ڈولی کے اندر دیکھا تو دیکھکر حیران ہو گیا کہ اُس کے اندر جنرل نکلسن پڑے ہوئے ہیں، انہوں نے مجھ سے کہا کہ کہار ڈولی رکھ کر لوٹنے چلے گئے ہیں، میں اس وقت بڑی تکلیف میں ہوں اور چاہتا ہوں کہ مجھے کوئی ہسپتال میں پہنچا دے، وہ اس طرح لیٹے ہوئے تھے کہ اُن کا زخم دکھائی نہیں دیتا تھا۔ نہ چہرہ سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کے کوئی زخم لگا ہے، اس لئے میں نے کہا آپ گھبرائیے نہیں اچھے ہو جائیں گے، آپ کے کاری زخم نہیں لگا ہے تو انہوں نے کہا نہیں صاحب میں تو مر رہا ہوں، میرے جینے کی اب کوئی آس نہیں ہے۔ یہ سُنکر میں نے فوراً بمشکل چار آدمی تلاش کئے اور اُن کو ایک سارجنٹ کے سپرد کیا اور زخمی افسر کا نام اُس کو بتا کر حکم دیا کہ ان کو ہسپتال میں جلد پہنچا دو۔

اس کے بعد میں گھوڑے پر سوار ہو کر ہوپ گرینٹ اور ٹومبس کی تلاش میں نکلا اور ان دونوں کو زندہ پایا، یہ دیکھکر میں فوراً گرجا میں واپس چلا آیا، اور تمام حالات بیان کئے، جنرل ولسن یہ خبر سُنکر تو خوش ہوا کہ ہوپ گرینٹ اور ٹومبس زندہ ہیں، مگر مسٹر ریڈ اور مسٹر کیمبل کی ناکامیوں کا اور نکلسن صاحب کے زخمی ہونیکا

اور بہت سے سپاہیوں کے مرنے اور زخمی ہونیکا حال سنکر جنرل کی ہمت پھر پست ہوئی اور اُس نے کہا کہ دانشمندانہ کام یہی ہے کہ فوج کو لیکر الٹا پہاڑی پر چلا جاؤں مگر تمام افسر اس کے خلاف تھے، جنرل نکلسن سے پوچھا گیا کہ ولسن شہر سے واپس آنا چاہتے ہیں تمہاری کیا رائے ہے؟ اُسوقت جنرل نکلسن پر سکرات کا عالم طاری تھا مگر اُنہوں نے غصہ سے بے قابو ہو کر اُسی حالت میں کہا کہ "ابھی تک مجھ میں اتنی قوت موجود ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو میں ولسن کو گولی سے ماردوں" غرض ولسن صاحب تمام افسروں کی مخالفت سے مجبور ہو گئے اور شہر سے واپس جانیکا خیال ترک کر دیا گیا۔

۱۱ رمئی ۵۷ء کو جو دہلی انگریزوں کے قبضہ سے نکلی تھی وہ ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو پھر دوبارہ قبضہ میں آگئی۔ آج کی لڑائی میں چھیاسٹھ افسر اور ۱۱۰۴ (گیارہ سو چار) آدمی مجروح و مقتول ہوئے۔ شہر فتح ہو گیا تھا۔ مگر پوری طرح سے قبضہ میں نہ آیا تھا ہتھیار بند دشمن شہر میں موجود تھا اور اُس کے پاس توپیں بھی کافی تھیں۔ لیکن چونکہ انگریزوں کے پاس مضبوط مورچے آگئے تھے اس واسطے پندرہ۔ سولہ۔ سترہ۔ اٹھارہ ستمبر کی تاریخوں میں جنگ برابر جاری رہی۔ لیکن ہر روز باغیوں کو شکست ہوتی تھی اور وہ آہستہ آہستہ مورچے چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے تھے، آخر ۱۹ ستمبر تک تمام شہر قبضہ میں آگیا اور جنرل ولسن کو یقین ہوا کہ اب کچھ خطرہ باقی نہیں ہے اور میں واقعی دہلی شہر پر قابض ہو گیا ہوں۔

بہادر شاہ بادشاہ کا گرفتار ہونا

لارڈ گورنر بخت خاں کی تقریر

جب ۱۹ ستمبر کی رات کو انگریزوں نے شہر کے بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا تو بہادر شاہ

نے قلعہ سے نکل جانے کا ارادہ کیا، اس وقت باغیوں کا مشہور سپہ سالار محمد بخت خاں
جو بریلی کا رہنے والا تھا اور جس کی دانشمندی اور فوجی کارگزاری بادشاہ اور تمام
امراء اور فوجی افسروں میں بالاتفاق مانی جاتی تھی، اور جس کو بہادر شاہ کے مزاج
میں اتنا دخل ہو گیا تھا کہ اس کی رائے کے بغیر بادشاہ کچھ کام نہ کرتے تھے اور اس کو
لارڈ گورنر کا خطاب دیا تھا، رات کے وقت بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور
عرض کی، کہ اگرچہ انگریزوں نے دہلی شہر کو لے لیا ہے لیکن اس سے ہمارا کچھ بہت زیادہ
نقصان نہیں ہوا، تمام ہندوستان ہمارے ساتھ ہے، اور ہر شخص کی نظر آپ کی ذات اور
آپ کے حکم پر لگی ہوئی ہے، حضور کچھ تردد نہ فرمائیں، میرے ساتھ تشریف لے چلیں
میں پہاڑوں میں بیٹھکر ایسی زبردست مورچہ بندی کروں گا کہ انگریزوں کا فرشتہ بھی
وہاں نہ آسکے گا، دہلی پایہ تخت ہے۔ فوجی قلعہ نہیں ہے۔ لڑائیوں کے لئے ایسے
مقامات مناسب نہیں ہوتے۔ چند مہینے جو ہمنے انگریزوں کا مقابلہ کیا
اور شہر کو بچائے رکھا یہ بھی کچھ معمولی بات نہیں ہے، ہمارا شہر نشیب میں تھا
اور انگریز پہاڑی پر تھے۔ کوئی ناتجربہ کار فوج بھی پہاڑی جیسے مضبوط مورچہ پر
ہوتی تو اس کو بھی دہلی کا فتح کر لینا کوئی دشوار نہ ہوتا۔ سب سے بڑی خرابی اس بات
نے ڈالی کہ حضور کے صاحبزادے مرزا مغل بہادر فوج کے کمانڈر انچیف
بنادئے گئے۔ وہ لڑائی کے فن سے واقف نہ تھے، نہ اُن کو یہ معلوم تھا کہ خود سر
اور سرکش فوجوں کو کن طریقوں سے قابو میں لایا جاتا ہے اور ان میں ضبط انتظام
اور اطاعت مندی کن صورتوں سے جاری ہوتی ہے، میں نے زندگی کا بڑا
حصہ فوجی کام میں صرف کیا تھا۔ اگر میرزا مغل میرے منصوبوں میں
رخنے نہ ڈالتے اور حارج نہ ہوتے تو یقیناً اسی خود سر فوج سے انگریزوں کو
شکست دیدیتا۔ ہمکو سب سے بڑی دشواری یہ درپیش تھی کہ رسد رسانی کا انتظام کرنیوالا

ہمارے ہاں کوئی نہ تھا، ملک میں ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ ہم سب اگر پوری یکدلی سے
انگریزوں جیسے عاقل دشمن کا مقابلہ کرتے تو بے سروسامانی کے باوجود
اس کو پہاڑی سے بھگا دینا دشوار نہ تھا، مگر ہم کو آپس کے بگاڑ اور ایک
دوسرے پر بھروسہ نہ کرنے کے سبب وہ قوتیں جو دشمنوں کے مقابلہ میں خرچ
کرنی چاہیئے تھیں خانگی جھگڑوں میں بیکار صرف کرنی پڑیں۔

مگر اب بھی کچھ نہیں گیا ہے اور مکرر عرض کرتا ہوں کہ کچھ بھی نہیں گیا ہے۔ تمام
ہندوستانی ریاستیں اپنی اپنی جگہ پر غور سے چپ چاپ بیٹھی دیکھ رہی ہیں کہ اونٹ
کس کروٹ بیٹھتا ہے، جس وقت ہمارا پلہ ذرا بھی بھاری اور مضبوط ہو جائے گا
وہ سب ہماری امداد کے لئے اُٹھ کھڑی ہوں گی، کیونکہ ہر ریاست کا دل انگریزوں
سے پک گیا ہے اور وہ یقین کرنے لگی ہیں کہ انگریز رفتہ رفتہ ہندوستان کی ہر
ریاست کو نگل لینا چاہتے ہیں، ان کو ہمیشہ بہانوں کی تلاش رہتی ہے۔ جھانسی۔
ناگپور اور پونہ کی ریاستوں کا حال سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ انگریزوں نے
کیسے عجیب مگر خلاف انصاف حیلوں اور بہانوں سے ان ریاستوں کو ضبط کر لیا۔

ہندوستان کے ہر باشندے کو اپنا مذہب عزیز ہے، اور ہر شخص یقین کرتا ہے کہ
انگریز ہمارے پیارے مذہب کو بھی ہم سے چھین لینا چاہتے ہیں اور ان کی جگہ جبراً ہمارے
گلو میں عیسائی مذہب کا طوق غلامی ڈالدینا انکے مدنظر ہے، ایسی حالت میں آپ یقین
کیجئے، کہ اگر آپ محفوظ مقامات میں بیٹھکر انگریزوں کا مقابلہ کریں گے تو تمام ملک ہمارا
ساتھ دیگا، آدمی رسد کا سامان اور روپیہ اور ہتھیار لڑائی میں انہی چار کی ضرورت
ہے اور یہ چاروں ہمکو اس افراط سے مل سکتے ہیں کہ اگر انگریز اپنی ملک کے بچہ بچہ کو بھی
چڑھا کر لے آئیں تب بھی ہم صدیوں تک انکا مقابلہ کر سکتے ہیں اور آج تو ان کے مددگار
ہمارے ہی ملکی بھائی ہیں جنکو بہکا سکھا کر اور لوٹ و انعام کے وعدے دیکر وہ سمیٹ لائے

ہیں کل جس وقت ہمارے پاؤں مضبوط ہو جائیں گے تو ہم بھی ان سے اُسی قسم کے وعدے کر سکیں گے جو انگریزوں نے ان سے کیے ہیں اور ہمارے ساتھ مل جانا انکا یقینی ہو گا۔

جہاں پناہ کے سامنے یہ عرض کرنا آفتاب کو شمع دکھانا ہے کہ حضور کے اجداد نے اس سے بڑھ بڑھ کر شکستوں اور ناکامیوں کا مقابلہ کیا ہے۔ شہنشاہ بابر بعض اوقات دشمنوں میں ایسے گھرے ہیں کہ تنہا بھاگنے کے سوا چارۂ کار نہیں رہا تھا، شہنشاہ ہمایوں کیسی بے کسی اور بے بسی میں ایران بھاگ کر گئے تھے۔ مگر ان کے استقلال نے تمام دشواریوں اور مشکلات کو فتح کر لیا جس کے بعد اُن کے خاندان نے اس سرزمین پر سینکڑوں برس حکومت کی۔ آپ بھی اُسی بزمِ عالم افروز کی شمع حقیقی ہیں اور آپ کے ساتھ تو ملک کے بچہ بچہ کو ہمدردی ہے، تمام ہندستان آپ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو کر مرنے مارنے کو تیار ہے، اگر حضور میرے ساتھ تشریف لے چلیں تو چند روز میں ہر چیز کو درست کر لوں گا، اور ظل سبحانی کو ہر فکر اور تکلیف سے محفوظ رکھوں گا۔"

بادشاہ بخت خاں کی تقریر سے بہت متاثر ہوئے، اور فرمایا۔ ہم ہمایوں کے مقبرے جاتے ہیں، تم کل صبح وہاں آؤ اور ہم سے ملو، اُس وقت تمام اُمور کا فیصلہ ہو جائے گا۔

میرزا الٰہی بخش کی تقریر

اِدھر تو یہ ہو رہا تھا اُدھر میرزا الٰہی بخش انگریزوں کی طرف سے اس بات پر مامور کیے گئے تھے کہ کسی طرح بادشاہ کو باغیوں کے ساتھ نہ جانے دیں۔ منشی رجب علی جو انگریزی کیمپ میں مخبری کے دفتر کے سردفتر تھے اور ہڈسن صاحب کی ناک کا بال بنے ہوئے تھے وہ برابر میرزا الٰہی بخش کو پیغام بھیج رہے تھے کہ اگر تم نے بادشاہ کو باغیوں کے ساتھ جانے سے روک لیا تو انگریز تم کو نہال کر دیں گے

اور ساری عمر تم کو اور تمہاری اولاد کو اپنے انعامات سے شاہانہ زندگی بسر کرائیں گے
(انگریزوں نے یہ وعدہ پورا کیا۔ بارہ سو روپے ماہوار پنشن ان کی اولاد کو ملتی ہے)

جسوقت بخت خاں بادشاہ سے ملاقات کرکے چلا گیا تو مرزا الٰہی بخش بادشاہ کے سامنے آئے اور عرض کیا کہ "لارڈ گورنر بخت خاں بہادر نے جو کچھ حضور عالی کے سامنے گزارش کیا ہے فدوی کو اُس کے حرف حرف سے اتفاق ہے، مگر مجھے ایک ضرور معاملہ گوشگزار کرنا ہے اور وہ یہ ہے کہ آیا یہ لڑائی حضور سے ہے یا باغی فوج سے ہے۔ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں کی فوج اُن سے باغی ہوگئی اور سرکشی کرکے آپ کے پاس آگئی، آپ مجبور تھے، آپ کے پاس طاقت نہ تھی جو اُن کو اپنے پاس نہ آنے دیتے، انگریز اندھے نہیں ہیں، وہ آپکی مجبوری کو اچھی طرح جانتے ہیں، اُن کو معلوم ہے کہ آپ کے نام سے باغیوں نے جسقدر کام کئے ہیں اور جیسے جیسے حکم احکام جاری کرائے ہیں اُن میں سے ایک میں بھی آپکا دخل نہیں ہے، پھر آپ کو کس بات کا اندیشہ ہے فکر نہ کرنا چاہیئے۔ البتہ اگر آپ باغیوں کے ساتھ چلے گئے۔ تب بے شک انگریز آپ سے باز پُرس کریں گے اور آپکو مجرم قرار دینے کا ایک بہانہ اُن کو مل جائے گا۔ مجھ کو ذرا بھی یقین نہیں ہے کہ باغی کسی جگہ جمکر مقابلہ کرسکیں گے۔ بخت خاں بہادر نے جو کچھ کہا اُس کو تو میں لفظاً لفظاً مانتا ہوں، بیشک ہندوستان کی ریاستیں اور ہندو مسلمان دل سے آپکے ساتھ ہیں، لیکن میں یہ نہیں مانتا کہ باغی فوج آپ کے یا بخت خاں کے قابو میں رہے گی، جو فوج ایک ایسے آقا کے قبضہ میں نہ رہ سکی جس کے پاس روپیہ۔ علم اور ہنر اور سب سے بڑی دولت عقل بخت خاں سے کہیں زیادہ تھی تو پھر اکیلے بخت خان بیچارے کیونکر ایسی خود سر اور بے مہار فوج کو مطیع کرسکیں گے۔

گرمی کا موسم ہے، برسات آگئی ہے، حضور کی ضعیفی اور ناتوانی کا زمانہ ہے۔

گھر سے باہر نکلکر مسافرت میں امن بھی ہو تب بھی گھر کا سا آرام میسر آنا محال ہوتا ہے اور لڑائی بھڑائی کی حالت میں تو لازمی طور سے بڑی بڑی تکلیفوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، آپ چھوٹے چھوٹے شہزادوں، شہزادیوں اور پردہ نشین بیگمات کو کہاں لیئے لیئے پھریں گے لہذا میری گزارش تو یہی ہے کہ آپ باغیوں کے ساتھ تشریف نہ لیجائیں، میں انگریزوں سے ملکر تمام معاملات کی صفائی کرادوں گا اور آپ پر آپ کی اولاد پر ایک حرف نہ آنے دونگا، سلطنت کا انجام جو کچھ ہو۔ آپ کی پلاؤ کی رکابی کہیں نہیں جائے گی"

مرزا الٰہی بخش کی یہ تقریر سُنکر بادشاہ چُپ ہو گئے، کچھ جواب نہ دیا، البتہ جب ایک خواجہ سرا نے عرض کیا کہ حضور صاحب عالم بہادر تو انگریزوں سے ملے ہوئے ہیں، آپ بخت خان بہادر کی گزارش پر توجہ فرمایئے، ان لوگوں کے کہنے میں نہ آیئے، مرنا اور تکلیف اُٹھانا تو ہر زندگی کے ساتھ لگا ہوا ہے" تو بادشاہ نے فرمایا میں دونوں باتوں پر غور کر کے کل جواب دوں گا۔

دوسرے دن بادشاہ اور اُن کی بیگمات قلعہ سے روانہ ہو کر ہمایوں کے مقبرہ میں آئے، بادشاہ نے عورتوں اور بچوں کو تو ہمایوں کے مقبرے میں بھیجا، اور خود درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رضہ میں جاکر پہلے سلام کیا اور پھر مقبرہ میں واپس آ گئے، مرزا الٰہی بخش نے تمام کیفیت منشی رجب علی کے ذریعہ سے ہڈسن صاحب کو بھیجدی تھی، اور لکھدیا تھا کہ بظاہر میں نے بادشاہ کو بخت خاں کے ساتھ جانے سے روک لیا ہے اور کل دوبارہ مقبرہ ہمایوں میں ملنے کا وعدہ ہوا ہے، اس لیئے آپ کچھ فوج لیکر مقبرہ کے غربی دروازہ کی طرف سے آجایئے کیونکہ بخت خاں شرقی دروازہ سے مقبرہ کے اندر آئیگا، اُس کی فوج دریا کی ریتی میں پڑی ہوئی ہے جسوقت بخت خاں رخصت ہو کر جائے آپ فوراً اندر آ کر بادشاہ کو گرفتار کر لیجیئے۔

ہڈسن صاحب نے اس خبر کی اطلاع جنرل ولسن کو دی اور اس کے ساتھ ہی منشی رجب علی کو حکم بھیجا کہ تم مرزا الٰہی بخش کو اطلاع دیدو کہ وہ جہاں تک ہو سکے بادشاہ کو بخت خاں کے ساتھ نہ جانے دیں اور جب بخت خان چلا جائے تو ۲۴ گھنٹے تک بادشاہ کو مقبرے میں روکے رکھیں، اس کے بعد سب انتظام ہو جائے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جس وقت بخت خان مقبرہ ہمایوں میں بادشاہ کے پاس آیا تو بڑی دیر تک حجت بازی رہی، بادشاہ جانا چاہتے تھے، بخت خاں لیجانا چاہتا تھا، اور میرزا الٰہی بخش روکتے تھے، بخت خاں اور میرزا الٰہی بخش کی بھی آپس میں کچھ تیز و ترش گفتگو ہوئی۔ مرزا الٰہی بخش نے کہا: لارڈ گورنر صاحب اکل آپ نے فرمایا تھا کہ میں حضور کو ہر تکلیف و فکر سے محفوظ رکھونگا، تو کیا اسکا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ جہاں پناہ کے نام کی آڑ میں آپ خود حکومت کرنا چاہتے ہیں ظل سبحانی کو اس سخت موسم اور اس بڑھاپے کی حالت میں آپ کیا محض اس وجہ سے لیجاتے ہیں کہ ہندوستان کی بادشاہی آپ کو ملجائے اور صدیوں کا انتقام مغلوں سے لیا جائے جنہوں نے پٹھانوں کی سلطنت تلوار کے زور سے چھینی تھی میں جانتا ہوں کہ آپ بھی پٹھان ہیں اور پٹھان سینکڑوں برس تک کینہ کو بھولتے نہیں۔"

مرزا صاحب کی یہ بات سنکر بخت خان اس قدر بگڑا کہ قریب تھا مرزا صاحب کو ہلاک کردے مگر بادشاہ نے اس کو روکا اور فرمایا: "بہادر! مجھے تیری ہر بات کا یقین ہے اور میں تیری ہر رائے کو دل سے پسند کرتا ہوں مگر جسم کی قوت نے جواب دیدیا ہے، اس لیۓ میں اپنا معاملہ تقدیر کے حوالہ کرتا ہوں مجھکو میرے حال پر چھوڑ دو اور بسم اللہ کرو۔ یہاں سے جاؤ اور کچھ کام کر کے دکھاؤ میں نہیں، میرے خاندان میں سے نہیں نہ سہی تم یا اور کوئی ہندوستان کی لاج رکھے۔ ہمارا فکر نہ کرو۔ اپنے فرض کو انجام دو۔"

بخت خاں اس جواب سے مایوس ہوگیا اور ہونٹ چباتا ہوا مقبرہ کے شرقی دروازہ سے دریا کی طرف اُتر گیا، اور فوج کو ساتھ لیکر ایسی جگہ غائب ہوا جہاں آج تک کوئی نہ پہنچ سکا۔ وہ ایسا عاقل آدمی تھا اور اُسکی فوج اُسکی ایسی اطاعت گزار تھی کہ جب سے اُس نے فوج سمیت بغاوت کی تھی اور دہلی میں آیا تھا اُسوقت سے دہلی کی شکست تک کبھی اُسکا یا اُسکی فوج کا کچھ نقصان نہیں ہوا۔ دہلی نے چند مہینے تک جو مقابلہ کیا وہ اسی کی حسن تدبیر کا نتیجہ تھا ورنہ باغی فوجیں ایسی ابتری کی حالت میں تھیں کہ دو دن بھی مقابلہ نہ کرسکتیں۔

بہادر شاہ سے رخصت ہونے کے بعد بھی اسکی عقل نے اسکا ساتھ دیا اور وہ ایسا روپوش ہوا کہ انگریزوں کے انتقام سے خود بھی بچا رہا اور اُسکی فوج کا ایک آدمی بھی محفوظ رہا، حالانکہ بغاوت کا وہی سب سے بڑا سرغنہ اور پیشوا تھا۔ قسمت نے بخت خاں کو ناکام رکھا ورنہ عجب نہیں تھا کہ وہ ہندوستان کا تاجدار بنجاتا۔ اور انگریزوں کو ملک سے خارج کرنے کے بعد تیموریوں کی کمزور ہستی کو بھی درمیان سے دور کردیتا اور دوسرا شیر شاہ تاریخوں میں لکھا جاتا۔

میجر ہڈسن کو میرزا الٰہی بخش کے ذریعہ سے خبر پہنچی کہ باغی فوج بادشاہ کو ساتھ لیجانے میں کامیاب نہیں ہوئی اور اب بادشاہ کا مقبرہ میں کوئی مُحدوش حمایتی باقی نہیں رہا ہے تو اُنھوں نے جنرل ولسن سے اجازت مانگی کہ میں وہاں جاکر بادشاہ کو گرفتار کر لاؤں۔ جنرل نے اجازت دی، مگر اسوقت افسروں میں یہ بحث ہونے لگی کہ بادشاہ کو زندہ لایا جائے یا قتل کردیا جائے؟ جنرل ولسن کہتا تھا اُس کو قتل کردینا چاہیئے، مگر دوسرے افسر اسکے خلاف تھے، آخر جنرل نے بھی مان لیا کہ بادشاہ کو قتل نہ کیا جائے، کیونکہ ابھی صرف دہلی قبضہ میں آئی تھی باقی تمام ہندوستان بغاوت کی آگ سے گرم ہو رہا تھا اس لیئے مصلحت یہ تھی کہ بادشاہ کو

زندہ رکھا جائے۔

میجر ہڈسن ۵۰ سوار لیکر مقبرہ ہمایوں کے مغربی دروازہ پر آیا، اور وہیں باہر کھڑا رہا اور اندر بادشاہ کو اطلاع بھیجی کہ میں آپکو گرفتار کرنے آیا ہوں آپ آیئے تاکہ میں اپنے ہمراہ لے جاؤں۔

ہڈسن صاحب بہت سنگدل اور سخت آدمی تھے، ایک انگریز مورخ نے لکھا ہے کہ "میدان جنگ اُن کا ناچ گھر تھا، جنگی نفیری کے سوا ان کو کسی موسیقی اور نغمہ کا شوق نہ تھا انسان کی کوئی مصیبت ان کے دل پر اثر نہ کرتی تھی۔ کسی کی خونریزی سے ان کو رنج و افسوس نہ ہوتا تھا، اور وہ آدمی کے مار ڈالنے کو تنکے کے توڑ ڈالنے سے کچھ زیادہ نہ سمجھتے تھے، بھاگتے اور پناہ مانگتے ہوئے آدمیوں کو بے تحاشا قتل کرنا اور اُن کے اسباب کو لوٹنا اُن کی دلی مسرت و شادمانی کے کام تھے غدر ۵۷ء کے وقت دہلی شہر میں جو مظالم ان کے ہاتھ سے ہوئے وہ انکی ذاتی خصلت کا نمونہ تھے برٹش خصائل کو ان سے تعلق نہ تھا۔"

اس سنگدلی کے باوجود انہوں نے بڑی مہربانی کی کہ مقبرہ کے باہر کھڑے رہے اور بادشاہ کے زنانہ میں بے دھڑک نہیں گھسے، مگر اس مہربانی کا باعث ممکن ہے یہ بھی ہو کہ وہ باغی فوج کی موجودگی سے خائف ہوں اور اُن کو اندیشہ ہو کہ اندر بخت خاں کے آدمی پوشیدہ بیٹھے ہونگے۔

بہرحال جس وقت ہڈسن صاحب کا پیغام بادشاہ کو پہنچا انہوں نے میرزا الٰہی بخش کو گھور کر دیکھا اور کہا "تم نے مجکو بخت خاں کے ساتھ جانے سے روکا اگر انگریزوں کو مجھ سے کچھ سروکار نہیں تھا جیسا کہ تم نے بیان کیا تھا تو پھر مجکو وہ گرفتار کرنے کیوں آئے ہیں؟" مرزا الٰہی بخش سر جھکائے خاموش کھڑے رہے اور بادشاہ نے پھر ارادہ کیا کہ کسی کو بھیجکر بخت خاں کو بلایا جائے مگر انگریزوں کے

ہمدردوں نے زینت محل بیگم کو پہلے سے تیار کر رکھا تھا، اُنہوں نے بادشاہ سے کہا کہ اب بخت خاں کے بلانیکا موقع نہیں رہا۔ معلوم نہیں وہ ملے یا نہ ملے اور ملے تو کیسا خبر ہے کہ یہاں کس قدر کشت وخون ہو اس لئے مناسب یہی ہے کہ آپ پہلے میجر ہڈسن سے اپنی اور میری اور جواں بخت کی جان کی امان طلب کیجئے، اور جب تک وہ اسکا وعدہ نہ کرے اُس کے پاس نہ جائیے۔

بادشاہ نے زینت محل کے کہنے کے بموجب ہڈسن کو پیغام بھیجا کہ میں اس شرط پر اپنے تئیں حوالہ کر سکتا ہوں کہ میری جان اور میری بیوی بچوں کی جان محفوظ رکھی جائے۔

ہڈسن صاحب نے اس شرط کو قبول کر لیا اور پورے دو گھنٹے اس حیص بیص میں خرچ کرنے کے بعد بادشاہ مقبرہ سے باہر تشریف لائے۔ زینت محل بیگم و شہزادہ جواں بخت پالکیوں میں سوار پیچھے تھی، اور بادشاہ چند خواجہ سراؤں کیساتھ پیدل آگے تھے۔

عبرتناک منظر

میجر ہڈسن نے اپنے سواروں کو کھنڈروں اور قبروں کی آڑ میں کھڑا کر دیا تھا اور خود دو تین گوروں کے ساتھ اکیلے سامنے کھڑے تھے، جوں ہی بادشاہ کی نظر ہڈسن پر اور ہڈسن کی نگاہ بادشاہ پر پڑی ایک عجیب عبرت خیز نظارہ پیش آیا۔ وہ بادشاہ جو گورنر جنرل سے بھی بڑی تمکنت کے ساتھ بات کرتا تھا اور جس کو کسی معمولی درجہ کے انگریز کا بغیر خاص مراسم آداب ادا کرنیکے سامنے بلانا گوارا نہ تھا آج وہ خود ایک معمولی خفیہ پولیس کے افسر کے سامنے آیا، اور کہا: "کیا تم ہی ہڈسن ہو؟" ہڈسن نے کہا: ہاں میرا نام ہڈسن ہے۔ بادشاہ نے کہا: "اگر تم ہڈسن

ہو تو میں اسوقت تمہاری زبان سے بھی اس فقرہ کو سننا چاہتا ہوں، جو تم نے ابھی مقبرہ کے اندر مجھکو کہلا بھیجا تھا یعنی تم میری جان اور میری بیوی زینت محل اور لڑکے جواں بخت کی جان کے ذمہ دار ہو"

ہڈسن صاحب نے باوجود سخت مزاجی کے نرمی سے جواب دیا۔ آپ اطمینان رکھیے آپ کی اور زینت محل بیگم اور جواں بخت کی جان کو کچھ خطرہ نہیں ہے"

اس کے بعد پالکی لائی گئی اور بادشاہ کو اسمیں سوار کیا گیا اور سواروں کے محاصرہ میں بادشاہ اور ان کی بیگم اور لڑکے کو لیکر ہڈسن صاحب روانہ ہو گئے۔

لارڈ کرزن کے دربار دہلی کے موقع پر نمائش گاہ میں اُسوقت کی ایک قلمی تصویر رکھی گئی تھی جس کو دیکھ کر میں نے ایک مضمون لکھا تھا جو غدر دہلی کے افسانوں کے پہلے حصہ میں چھپا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون کو یہاں نقل کیا جائے کہ اس کے قلمی اثر اور بیان ہذا کے سادہ اثر کو ناظرین ملا کر دیکھیں اور ان کو انقلابات، ایام کا تماشہ اچھی طرح نظر آسکے۔ وہ مضمون یہ ہے:۔

غدر کی تصویر

اللہ اللہ زمانہ کے نشیب و فراز میں کتنے پر حسرت نظارے ہیں۔ یہی دہلی جو اپنی گود میں ہزاروں ارمان بھرے دلوں کا خون بہتا دیکھ چکی ہے رہ رہ کے پلٹا کھاتی اور رنگ دکھاتی ہے، ایک دن وہ تھا کہ بابر کی تلوار نے ابراہیم لودہی کا خون دہلی کے ریگستان کو پلایا اور اس کے اہل و عیال کو حسرت و یاس کی مجسم تصویر بنا ہوا سامنے دست بستہ کھڑا ہوا دیکھا یا ایک دن ایسا آیا کہ اسی کی اولاد اپنے اعمال کی بدولت ان بیکسیوں کا نمونہ بنی۔

آہ! دہلی دربار کی نمائشگاہ میں داخل ہوتے ہی ایک تصویر نظر پڑی جس میں

بزم تیموری کی گل ہونے والی شمع ابوظفر بہادر شاہ مقبرہ ہمایوں میں میجر ہڈسن کے ہاتھوں گرفتار کیے جارہے ہیں پشت پر ہمایوں کا مقبرہ نظر آتا ہے۔ جس پر کچھ عجیب دلگیر افسردگی چھائی ہوئی ہے۔ بہادر شاہ عبا پہنے ہوئے کھڑے ہیں ہاتھ میں عصا ہے۔ چہرہ غم والم میں ڈوبا ہوا۔ بڑھاپے کا رنگ۔ اور تحملانہ یاس کا عالم ہے۔ میجر ہڈسن سرخ وردی پہنے بادشاہ کا دامن پکڑے کھڑے ہیں اور ان کے دو ہمراہی بادشاہ کی پشت پر نظر آتے ہیں۔ میجر ہڈسن کی اس بے باکانہ جرأت پر بادشاہ کا ایک بوڑھا جاں نثار تلوار سونت کر لپکتا ہے، ہاتھ میں ڈھال ہے اور بشرہ نڈھال، قریب پہنچتے پہنچتے برابر والا سولجر پستول سامنے کرکے اس کا بڑھا ہوا حوصلہ پست اور جوش انتقام سرد کر دیتا ہے۔

افسوس ہے کہ دنیا کے اس مصیبت خیز انجام پر بھی لوگوں کو اس کی ہوس باقی ہے نمائش سے چلتے وقت وہیں دیوان حافظ کا خود بخود کھلا ہوا ایک ورق نظر پڑا جس کی پہلی سطر تھی۔

آخر نظرے بسوئے ما کن اے دولت خاص حسرت عام

یہ پڑھتا ہوا باہر آیا اور اس مرقع کو مخاطب کرکے اس شعر کو دہراتا رہا۔

اس تصویر میں ہڈسن صاحب کا عبا کے دامن کو پکڑنا اور ایک جاں نثار کا حملہ کرنا محض مصوری کی خیالی داستان ہے، واقعات سے کچھ تعلق نہیں۔ البتہ نمائش گاہ میں اسی وقت دیوان حافظ کا نظر آجانا اور اس میں یہی شعر دکھائی دینا ایک خاص اثر کا واقعہ ہے، بیشک بہادر شاہ اس وقت انگریزوں کے لیے تو دولت خاص تھے، اور ہندوستان کے واسطے حسرت عام۔

ہڈسن کی نیت اس موقع پر یہ لکھنا تاریخی اطلاع دینا ہے کہ جنرل ولسن کی طرح میجر ہڈسن بھی بہادر شاہ کو قتل کر دینا چاہتے

تھے اور انہوں نے دیگر انگریزی افسروں کی مجبوری سے بادلِ ناخواستہ بادشاہ سے جانکی
امان کا وعدہ کرلیا تھا، ورنہ نیت ان کی یہی تھی کہ بادشاہ کو قتل کر دیا جائے
چنانچہ اس دن کی ذاتی ڈائری میں میجر ہڈسن نے لکھا ہے کہ "میں دہلی میں بادشاہ کو
مُردہ لانا بہ نسبت زندہ لانے کے زیادہ پسند کرتا تھا"
لطف کی بات یہ ہے کہ اسی یادداشت میں ہڈسن نے یہ فقرہ بھی لکھا ہے کہ "بہادر
شاہ بغاوت میں عملی حصہ لینے سے بری تھے"
قصہ مختصر ہڈسن بادشاہ، اُن کی بیگم اور جواں بخت کو لیکر آہستہ آہستہ شہر
کے لاہوری دروازہ کی طرف لے گئے، اور چاندنی چوک کے بازار میں ہو کر لال
قلعہ کے اندر لائے اور وہاں زینت محل کے مکان میں اُن کو مقید کر دیا۔
لاہوری دروازہ سے لانے اور تمام چاندنی چوک کو عبور کرانے کی وجہ یہ تھی کہ کُل
شہر کو بادشاہ کے گرفتار ہو جانے کی اطلاع ہو جائے۔
قلعہ میں پہنچکر بادشاہ نے خواہش کی کہ جنرل لسن کو میرے پاس بُلایا جائے۔میں اُس
سے ملنا چاہتا ہوں۔ جنرل لسن نے یہ پیغام سُنکر جواب دیا "مجھ کو اب اُن سے
ملنے کی ضرورت نہیں ہے اور میں اُن سے ملنا نہیں چاہتا" اس انکار کے بعد
جنرل لسن نے اپنے ایڈی کیمپ لفٹنٹ ٹرینل کو بادشاہ کے پاس بھیجا جس نے
گورے سپاہیوں کا پہرہ بادشاہ کے مکان پر لگا دیا۔

چشمِ تصور

اگرچہ بہادر شاہ اور اُن کے باپ اکبر شاہ اور اُن کے باپ شاہ عالم ایک اعتبار سے
برٹش گورنمنٹ کے قیدی تھے اور اُن کو قید کی عادت پڑ گئی تھی۔ پھر بھی آج کی رات
جبکہ وہ اپنے ہی قلعہ میں قید کیئے گئے تھے۔ انکے دل کی کیا حالت ہوگی، اور ان کی

پیاری بیوی زینت محل اور نوعمر شہزادہ جواں بخت کا کیا عالم ہوگا۔

تصور کی آنکھ کے سوا کوئی اور ذریعہ قیدیوں کے قلبی احساس اور پہلی رات کی غمگینی کا منظر اصلی طور سے نہیں دکھا سکتا، ان کو باوجود ہڈسن کے اقرار کے اپنی زندگی کے محفوظ ہونے کا یقین نہ ہوگا، وہ اپنی راحت و عیش اور حکومت کے رہے سہے نام و نشان کو آج کی رات ختم شدہ خیال کرکے دل ہی دل میں آخری چراغ کی طرح مایوسی کی ہوا سے جھلملا رہے ہوں گے اور غم کی شدت سے کلیجہ اُنکے منہ کو آرہا ہوگا۔ کوئی چیز اُنکے سینہ کی طرف سے اٹھتی ہوگی اور اُسکا دھواں دماغ کی طرف چڑھ کر اُنکو جاں کنی کا مزا چکھاتا ہوگا۔

اُن کو اپنے باقی ماندہ بچوں اور رعایا کا خیال بھی بےچین کر رہا ہوگا جن کی امداد و ہمدردی کا اس عالم اسیری میں اب کوئی سامان اُنکے پاس باقی نہ رہا تھا، تصور کی آنکھ جب یہ دیکھتی ہے تو اُسکا بُرا حال ہوجاتا ہے۔

بادشاہ کے بیٹوں کا قتل

منشی ذکاء اللہ صاحب کا بیان ہے کہ بادشاہ کی گرفتاری کے دوسرے دن منشی رجب علی اور مرزا الٰہی بخش نے خبر دی کہ مرزا مغل اور مرزا خضر سلطان اور مرزا ابو بکر بادشاہ کے بیٹے اور ایک پوتے بھی مقبرہ ہمایوں میں موجود ہیں اور یہ وہی ہیں جنہوں نے قلعہ میں انگریز عورتوں اور بچوں کے قتل میں حصہ لیا تھا میجر ہڈسن کا خون اس خبر سے جوش میں آگیا اور وہ جنرل ولسن سے اجازت لیکر شہزادوں کے قتل کے لئے روانہ ہوا۔ میکڈانلڈ صاحب بھی ہڈسن کے ہمراہ تھے آج ہڈسن نے ۵۰ سواروں کی جگہ ایک سو سوار ہمراہ لئے تھے اور منشی رجب علی اور مرزا الٰہی بخش دونوں جاسوس بھی ساتھ تھے۔

تینوں شہزادے میرزا مغل اور میرزا خضر سلطان اور میرزا ابوبکر مقبرے کے اندر تھے، ہڈسن باہر کھڑا ہو گیا اور شہزادوں کو اطلاع بھیجی کہ میں آپ کو گرفتار کرنے آیا ہوں، مگر چونکہ شہزادوں کے ساتھ بہت سے جنگجو آدمی بھی تھے اس لئے وہ جمعیت بھی زیادہ لایا تھا، اور اندر جانے کی جراٗت بھی نہ کر سکتا تھا۔

شہزادوں نے اپنے باپ کی طرح دو گھنٹے تک یہی حجت کی کہ اگر ہماری جانوں کی ذمہ داری کی جائے تو ہم اپنے تئیں حوالہ کر سکتے ہیں، ورنہ نہیں میجر ہڈسن نے جواب دیا کہ میں آپ کی جانوں کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ میں جنرل ولسن کے ماتحت ہوں اور مجھے ان معاملات کے اختیارات نہیں ہیں۔ بہادر شاہ سے تو میں نے اس وجہ سے اقرار کر لیا تھا کہ جنرل ولسن نے مجکو اس اقرار کی اجازت دیدی تھی، شہزادوں کو بلا کسی شرط کے میرے پاس آجانا چاہیئے اسکے بعد دیکھا جائیگا جنرل ولسن کے ہاتھ سب کچھ مختار ہے۔

شہزادوں نے یہ جواب سنکر اپنے رفیقوں سے صلاح لی اور اُن سب نے کہا کہ "تیموری خاندان کے لوگ اس طرح مجبور ہو کر قید نہیں ہوا کرتے۔ تلوار اٹھاتے ہیں اور لڑتے ہیں، پھر یا قسمت یا نصیب کا معاملہ ہوتا ہے، داراشکوہ کو جب اورنگ زیب نے قتل کرنا چاہا اور قاتل قید خانہ میں آئے تو دارا ترکاری چھیلنے کی چھری لیکر کھڑا ہو گیا اور کچھ دیر تک قاتلوں کا مقابلہ کرتا رہا ہم کو بھی دلیرانہ کام کرنا چاہیئے، ہڈسن اور اُس کے سو سواروں کو ہم تھوڑی دیر میں شکست دے سکتے ہیں، اوّل مرنا آخر مرنا۔ مرنا تو ہر حال میں ہے پھر بہادری کی موت کیوں نہ مریں۔"

شہزادوں نے بھی اس تجویز کو پسند کیا، مگر میرزا الٰہی بخش نے پھر نصیحت کا دفتر کھول دیا اور ایسے اُتار چڑھاؤ شہزادوں کو دیئے کہ وہ بچارے لڑنے کے خیال سے

دست بردار ہو گئے اور میرزا الٰہی بخش کے ہمدردانہ مشورہ کے موافق تن بہ تقدیر بلا کسی شرط کے ہڈسن کے پاس چلا جانا قبول کر لیا اور اپنے رفیقوں کو مقبرہ کے اندر رخصت کر کے ہڈسن کے پاس چلے آئے۔

جسوقت شہزادے ہڈسن کے سامنے آئے اُس نے ان کو خونخوار نظروں سے دیکھا مگر خاموش کھڑا رہا۔ اور رتھوں میں سوار ہو جانے کا حکم دیا۔ شہزادے سوار ہو گئے تو ہڈسن ان کو محاصرہ میں لیکر دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ اور جب دہلی ایک میل رہ گئی تو رتھوں کو ٹھہرایا۔ اور شہزادوں کو حکم دیا کہ رتھوں سے باہر آ جائیں اور اپنے کپڑے اُتار ڈالیں، شہزادوں نے یہ حکم سنکر آپس میں ایک دوسرے کو دیکھا اُن کو یہ اُمید ہرگز نہ تھی کہ ان کو اسی جگہ قتل کیا جائے گا، کیونکہ میرزا الٰہی بخش نے ان سے کہا تھا کہ جنرل ولسن کے اختیار میں فیصلہ ہے اور جنرل سے جس وقت سفارش کی جائے گی تو وہ بادشاہ کی طرح تم کو بھی جان کی امان دیدے گا۔ ہڈسن صاحب کو نہ امان دینے کا اختیار ہے نہ قتل کرنے کا۔ مگر جسوقت کہ ہڈسن نے ان کو رتھوں سے باہر آنے اور کپڑے اتارنے کا حکم دیا تو وہ اس کی وجہ کو بالکل نہیں سمجھے اور ایک دوسرے کو حیرت اور تعجب سے دیکھنے لگے۔

آخر وہ رتھوں سے اُترے اور اُنھوں نے اوپر کے لباس شہزادگی کو جسم سے جُدا کر دیا۔ اور ہڈسن کو دیکھنے لگے کہ اب کیا کہنا چاہتا ہے۔ اُن کو خیال تھا کہ شاید یہاں سے وہ ہم کو مقید کر کے پیدل لیجانا چاہتا ہے۔ یہ بات تو اُن کے خواب و خیال میں بھی نہ تھی کہ ہم اسی جگہ قتل کیے جائیں گے۔

ہڈسن نے جب ان کو لباس شہزادگی اُتارے ہوئے کھڑا دیکھا تو وہ غصہ سے دیوانہ ہو گیا اور اُس نے ایک سوار سے بھری ہوئی قرابین مانگی اور اُس کو ہاتھ میں لیکر تڑا تڑ تین فیر کیے۔ گولیاں شہزادوں کے سینے میں لگیں اور وہ ہائے دہو کہ

کہکر زمین پر گر پڑے، اور خاک میں لوٹنے لگے اور کچھ دیر کے بعد مر گئے۔
ہڈسن ان کے تڑپنے اور خاک و خون میں لوٹنے کو خوشی کے چہرے سے کھڑا ہوا دیکھتا رہا، اور جب وہ مر گئے تو اُن کی لاشوں کو لیکر کوتوالی پر آیا اور لاشوں کو ایک رات دن سر بازار لٹکائے رکھا۔"

ہڈسن نے شہزادوں کا خون پیا
جوان بیٹوں کے کٹے ہوئے سر بوڑھے باپ کی نذر کیئے گئے

ایک روایت تو شہزادوں کے قتل کی یہ تھی جس کو منشی ذکاء اللہ نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے اور دوسری روایت اور ہے جو دہلی میں عام طور سے مشہور تھی، اور میرزا الہی بخش کے ایک مصاحب خاص نے جو موقع پر خود موجود تھا میرے والد سے اس کو بیان کیا تھا اور والد نے اس قصہ کو میرے سامنے کہا۔ اور صرف ایک ہی روایت نہیں، میں نے صدہا آدمیوں کی زبانی ایک ہی شان سے یہ واقعہ سنا ہے، اور کسی بیان میں اختلاف نہیں پایا جاتا، اس واسطے میں اس روایت کو بھی درج کرتا ہوں۔

منشی ذکاء اللہ صاحب نے بھی اس روایت کو اپنی تاریخ کے صفحہ ۶۵ پر لکھا ہے مگر ایک لفظ یہ بڑھا دیا ہے کہ واقعہ غلط ہے۔ یعنی وہ اس کو تو تسلیم کرتے ہیں کہ شہزادوں کے قتل کا واقعہ دہلی میں اسطرح پر مشہور تھا، مگر وہ اس کو صحیح نہیں مانتے۔

وہ روایت جو شہزادوں کے قتل کی نسبت دہلی میں مشہور ہے اور جس کو منشی ذکاء اللہ نے غلط ٹھہرایا ہے اور جس کی روایت میرزا الہی بخش کے ایک مصاحب

شہزادہ میرزا مغل
غدر ۱۸۵۷ء میں باغی
فوج کے سپہ سالار۔
جو غدر میں
میجر ہڈسن کے ہاتھ
سے مارے گئے۔

نے میرے والد سے بیان کی یہ ہے کہ میرزا مغل اور میرزا خضر سلطان اور میرزا ابوبکر بھی بہادر شاہ کے ساتھ گرفتار ہوئے تھے، اور جب قیدی موجودہ جیلخانہ کے قریب پہنچے تو ہڈسن صاحب نے بادشاہ اور زینت محل اور جواں بخت کی پالکیوں کو ایک طرف ٹھہرا دیا، اور میرزا مغل اور میرزا خضر سلطان میرزا ابوبکر اور میرزا عبداللہ چار شہزادوں کو رتھوں سے اتارا اور اپنے ہاتھ سے انکو قتل کر کے ایک چلو خون کا پیا، اور کہا کہ اگر میں ان کا خون نہ پیتا تو میرا دماغ خراب ہو جاتا۔ کیونکہ ان لوگوں نے میری قوم کی بیکس عورتوں کو اور بچوں کے قتل میں حصہ لیا تھا، اور انکے دیکھنے سے میرا خون جوش کھاتا تھا۔

شہزادوں کے قتل کے بعد ان کے سر کاٹے گئے اور سروں کو بادشاہ کے سامنے لایا گیا اور ہڈسن نے کہا۔ یہ آپ کی نذر ہے جو بند ہو گئی تھی اور جس کو جاری کرانے کے لئے آپ نے غدر میں شرکت کی تھی۔ بہادر شاہ نے جوان بیٹوں اور جوان پوتے کے کٹے ہوئے سر دیکھے تو حیرت انگیز استقلال سے اُن کو دیکھکر مُنہ پھیر لیا اور کہا۔ الحمد للہ تیمور کی اولاد ایسی ہی سُرخرو ہو کر باپ کے سامنے آیا کرتی تھی۔ اس کے بعد شہزادوں کی لاشیں کوتوالی کے سامنے لٹکائی گئیں، اور سر جیلخانہ کے سامنے خونی دروازہ پر لٹکا دیے گئے جن کو ہزاروں آدمیوں نے دیکھا ؀

یہ وہی دروازہ ہے جس پر دارا کا سر بھی لٹکایا گیا تھا اور عبدالرحیم خاں خانخاناں کے لڑکوں کے سر بھی لٹکائے گئے تھے۔ اور اسی وجہ سے اب تک اس کو دہلی والے خونی دروازہ کہتے ہیں۔ اس دروازہ کی دیوار خارا کے پتھروں کی ہے اور خارا میں لوہے کا اثر ہوتا ہے جو برسات میں اپنا سُرخ رنگ بہایا کرتا ہے۔ چنانچہ اس کی دیوار پر اب تک سُرخ دھبّے پڑے نظر آتے ہیں۔ جن کو دیکھ کر عوام کہتے ہیں کہ یہ شہزادوں کے خون کا نشان ہے جس کو خدا نے قیامت تک کے لیے

محفوظ رکھا ہے۔

لارڈ رابرٹس جو بعد میں ہندوستان کے کمانڈر انچیف ہوئے اور جنکا جنگ یورپ کے زمانہ میں انتقال ہوا اور جو غدر ۱۸۵۷ء میں خود موجود تھے میجر ہڈسن کے اس فعل کی نسبت لکھتے ہیں:-

"ہڈسن نے یہ کام کرکے اپنی نیک نامی میں بٹہ لگا لیا۔ اُس نے شہزادوں کو بے ضرورت مار ڈالا"

اس روایت کی نسبت کہ ہڈسن نے شہزادوں کا خون پیا سوائے زبانی حکایتوں کے اور کوئی تاریخی سند میری نظر سے نہیں گزری، لیکن یہ خیال ضرور ہوتا ہے کہ جب بہادر شاہ گرفتار ہوئے تو میرزا مغل وغیرہ بھی اُسی وقت گرفتار کیئے گئے ہوں گے، کیونکہ وہ سب ایک ہی جگہ تھے، یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہڈسن صاحب نے بادشاہ کو تو گرفتار کیا اور ان لوگوں کو چھوڑ دیا جو انگریزوں کے قتل کے اصلی مجرم تھے اور جنہوں نے باغی فوج کی سرداری کی تھی اور جنکی نسبت یہ قوی اندیشہ تھا کہ اگر باغی فوج کے ساتھ چلے جائیں تو مدتوں انگریزی فوج کو پریشان کریں گے اس لیئے یقیناً اُن کو بھی بہادر شاہ کیساتھ ہی گرفتار کیا گیا ہوگا۔

یہ ہو سکتا ہے کہ بادشاہ کی گرفتاری سے کچھ دیر بعد وہ گرفتار ہوے ہوں اور انہوں نے جان بخشی کا وعدہ نہ ہونے کے سبب مقابلہ کا ارادہ کیا ہو۔

بہر حال اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ مقتول شہزادوں میں سے بعض اُن انگریزوں اور عورتوں اور بچوں کے قتل کرانے یا اُس قتل سے رضامند ہونے کے مجرم ضرور تھے جو ایام غدر میں قلعہ کے اندر مارے گئے تھے۔

چار مہینے اور چار دن کی بادشاہی

وہ جو کہتے ہیں چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات، یہ مثل بہادر شاہ پر بالکل صادق آئی۔ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو دہلی انگریزوں کے قبضہ سے نکلی اور بہادر شاہ کے قبضہ میں آئی اور چار مہینے اور چار دن کے بعد ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو پھر بہادر شاہ سے چھنکر انگریزوں کے قبضہ میں چلی گئی۔

یہ چار دن چار مہینے کی بادشاہت فقط نام کی بادشاہت تھی ورنہ فوجی سپاہی اسقدر بے ادب اور گستاخ تھے کہ پکار پکار کر کہتے تھے کہ جس کے سر پر ہم جوتی رکھ دیں وہی بادشاہ ہے، یوں دیکھنے اور کہنے کو بادشاہ کے نام کا ڈھنڈورہ پیٹا جاتا تھا، مگر بادشاہ کا حکم پوری اطاعت سے کوئی نہ مانتا تھا اور تمام شہر میں ایک عام افراتفری اور بے امنی چھائی ہوئی تھی۔

بخت خان اور میرزا مغل کا اقتدار بیشک تسلیم کیا جاتا تھا، اور میرزا خضر سلطان وغیرہ شہزادوں کے اختیارات بھی قایم نظر آتے تھے لیکن ضبط نظم اور ضابطہ کی اصلی پابندیاں نام کو بھی نہ تھیں، بہرحال جیسا کچھ بھی تھا پھر بھی بادشاہی کا نام ہو گیا تھا۔ جو چار مہینے چار دن کے بعد بالکل نابود ہو گیا، اور اب تو جبکہ ۱۹۲۲ء کا دور دورہ ہے بادشاہ کی اولاد دہلی میں بھیک مانگتی پھرتی ہے۔

بیمار اور زخمی قتل کر دیے جاتے تھے

منشی ذکاءاللہ صاحب اپنی تاریخ کے صفحہ ۶۴۶ پر لکھتے ہیں کہ جب جامع مسجد پر قبضہ ہو گیا تو خبر آئی کہ باغیوں کا کیمپ بالکل خالی پڑا ہے لفٹنٹ

ہڈسن سوار ریسکروڑ سے ہوتے گئے اور کیمپ پر قبضہ کرلیا۔ باغی ایسی گھبراہٹ میں گئے تھے کہ ان کی گیلی دھوتیاں الگنیوں پر پھیلی ہوئی تھیں اور ان کو اُتارنے کی فرصت بھی نہ ملی تھی۔

کیمپ میں جسقدر زخمی اور بیمار پائے گئے اُن کو قتل کر دیا گیا اور یہاں سے کپڑے اور گولی بارود بکثرت دستیاب ہوا"۔

پھر اُسی صفحہ پر لکھتے ہیں "بریڈ صاحب کی درخواست پر جنرل ولسن نے میگزین کی طرف سے قلعہ پر حملہ کرنے کے لیے ایک کالم بھیجا۔ ہوم صاحب نے بارود سے قلعہ کا دروازہ اُڑایا اور فوج نعرے لگاتی ہوئی اندر داخل ہوئی قلعہ کے حصہ میں باغیوں کا ہسپتال تھا اور وہاں وہ زخمی پڑے ہوئے تھے جو اپنی پلٹنوں کے ساتھ جا نہیں سکتے تھے انگریزی سپاہ نے اپنی گولیوں سے اُن کے زخموں کا علاج کر دیا"۔

اور بھی کئی واقعات بیماروں اور زخمیوں کے قتل و ہلاکت کے احوال غدر میں مذکور پائے جاتے ہیں، جن کو پڑھ کر افسوس ہوتا ہے کہ باغیوں کی حرکات کیسی ہی اشتعال انگیز اور ظالمانہ ہوں، پھر بھی انگریزوں کی متمدن اور مہذب قوم کو اس قسم کی وحشیانہ سفاکی سے احتیاط کرنی چاہیے تھی۔

بیماروں اور زخمیوں کا قتل کرنا ایسا ہی خوفناک جرم ہے جیسا عورتوں اور بچوں کا ہلاک کرنا، کوئی شخص بھی باغیوں کو ملامت کرنے سے خاموش نہیں ہے۔ کیونکہ انھوں نے بے گناہ عورتوں اور بچوں کو مارا تھا، مگر انگریزی فوج بھی زخمیوں اور بیماروں کو ہلاک کرنے کے ملامت سے محفوظ نہیں رہ سکتی ہے۔ جنرل ولسن کا یہ عذر تسلیم کرنے کے قابل نہیں ہے کہ فوج قابو سے باہر تھی اور اُسکے انگریز افسروں کو اپنی عورتوں اور بچوں کی مظلومیت یاد آتی تھی۔ کیونکہ وہ جنرل بہت ناقابل ہوتا ہے جو اپنے ماتحتوں پر

اقتدار نہ رکھتا ہو اور جس کو اتنا اختیار بھی نہ ہو کہ وہ خلاف تہذیب خلاف انسانیت مظالم شدید سے ماتحتوں کو روک سکے، یقیناً جنرل ولسن اور سب انگریز جوش انتقام میں بھول گئے تھے کہ بیماروں و رزخمیوں کا قتل کرنا بہت بڑی وحشیانہ و ظالمانہ خطا ہے ورنہ وہ ایسا نہ کرتے۔

دہلی والوں کے نزدیک
انگریزوں کے گولے شب برات کی آتشبازی تھی

دہلی شہر کے باشندوں کی یہ خصلت تمام ملک میں نرالی ہے کہ وہ غم اور مصیبت کے وقت بھی تفریح اور خوش باشی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ انگریزوں نے جب شہر پر گولہ باری شروع کی تو بجائے اس کے کہ باشندے خائف ہوتے یا گھبرا کر بھاگتے شب برات کی آتشبازی کی طرح توپوں کے گولے انکے لئے مذاق و تفریح کا ایک تماشہ ہو گئے۔ مکانوں کی چھتوں پر لوگ چڑھ جاتے اور لوگوں کی سیر دیکھتے اور جب گولے شہر کی طرف آتے تو بے تحاشا غل مچاتے، وہ آیا۔ وہ آیا۔ دیکھو وہ اُدھر چلا، آہا ہا وہ گرا۔ وہ پھٹا جس جگہ گولہ گرتا، وہاں سینکڑوں آدمیوں کی بھیڑ لگ جاتی تھی، گولے کچھ اس قسم کے تھے کہ ان سے کچھ زیادہ نقصان نہ ہوتا تھا شہر کی سڑکیں چوڑی تھیں، مکانوں کے صحن بھی فراخ تھے، باغات کی کثرت تھی اس واسطے لوگوں سے زیادہ نقصان نہ پہنچتا تھا، ہزاروں گولے آئے مگر نقصان دس بیس گھروں اور سو پچاس عورتوں، بچوں اور راجل رسیدہ مردوں کے سوا کسی کا نہ ہوا تعجب یہ ہے کہ چار آدمی مرتے تھے تو چار سو تماشہ دیکھنے کو وہاں کھڑے ہو جاتے تھے میں نے اپنے والد سے سُنا کہ جب پہاڑی پر سے گولہ باری ہوتی تھی ہم ہمایوں

کے مقبرہ کی چھت پر چڑھکر تماشا دیکھا کرتے تھے۔ ہمنے دیکھا کہ رات کے وقت گولہ توپ کے منہ سے نکلتا تو

ایک گول انگارہ

معلوم ہوتا تھا، وہ گول انگارہ شائیں شائیں کرتا ہوا دور نکل جاتا۔ اس کے بعد توپ کی آواز آتی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ گولہ پہلے نکل جاتا ہے، اور آواز بعد میں ہوتی ہے۔

مقبرہ ہمایوں پہاڑی سے ۴ میل کے فاصلہ پر ہے، رات کے اندھیرے میں گولہ چمک کے سبب پہلے دکھائی دیتا ہوگا اور آواز بعد میں آتی ہوگی، کیونکہ روشنی کی رفتار آواز کی رفتار سے تیز ہوتی ہے۔

دہلی والوں کی بے فکری اور خوش باشی اسی ایک واقعہ پر ختم نہ تھی بلکہ جب روزانہ پھانسیاں ہو رہی تھیں اور اندھا دھند قتل عام شہر میں جاری تھا تب بھی دہلی والوں کی خوش باشی کی عادت میں کمی نہیں ہوتی تھی۔ بڑے بڑے امرا کا یہ حال تھا کہ شام کو گرفتار ہوئے۔ حوالات میں بند کیے گئے۔ صبح پھانسی پانیکا یقین ہے، مگر رات کاٹنے کے لئے شطرنج۔ گنجفہ۔ چوسر ہو رہی ہے۔

اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ دہلی کی یہ خصلت کیسی عجیب ہے۔ یا تو یہ وجہ تھی کہ صدمے اٹھاتے اٹھاتے انکے دل سخت ہو گئے تھے اور یا خدا نے دہلی والوں کو دل ہی ایسا دیا ہے، جو کسی وقت بھی تفریح اور خوشباشی سے خالی نہیں رہتا۔

جانکنی کا ماجرا

کلیجہ شق ہو جانے کا بیان ہے۔ ۱۴ ستمبر کی تاریخ نے انگریزوں کو شہر کے اندر جگہ دی اور شہر والوں کو باہر نکلجانے کا حکم دیا۔ انگریز پہلے کشمیری و کابلی و

موری دروازے کے رُخ سے داخل ہوئے تھے، اس لئے وہاں کی آبادی سمٹکر فراش خانہ۔ ترکمان دروزہ اور اجمیری دروازہ کی طرف آگئی۔ مگر جب یہ علاقے بھی مفتوح ہو گئے تو باشندے دروازوں سے نکلکر جنگلوں اور دیہات میں بھاگنے لگے۔ وہاں گوجروں اور میواتیوں نے ان کو لوٹنا شروع کیا۔

باوجود اس عام بھاگڑ کے پھر بھی شہر میں ہزاروں گھر آباد تھے۔ ہندوؤں کا مشہور محلہ نیل کا کٹرہ تو بالکل آباد تھا۔ اسکا ایک آدمی بھی باہر نہیں گیا کیونکہ لالہ مہیسری پرشاد کمسریٹ کے گماشتے اس محلہ میں رہتے تھے، اور انھوں نے اپنی خیر خواہی اور خدمات سرکاری کے عوض اپنے محلہ کی حفاظت کا عہد افسروں سے لیلیا تھا بلی ماروں کے محلہ میں حکیم محمود خان صاحب کا مکان محفوظ تھا۔ کیونکہ پٹیالہ کے مہاراجہ نے اپنے تعلقات کے سبب ان کی حفاظت کا اقرار انگریزوں سے کرالیا تھا اور پٹیالہ کے فوجی سپاہی حکیم صاحب کے مکان پر بطور پہرہ دار ہر وقت موجود رہتے تھے۔ پٹیالہ کے وزیر دیوان نہال چند کا مکان بھی پٹیالہ کے تعلقات کے سبب محفوظ تھا بعض اور ہندو مسلمانوں کے مکان بھی سرکاری خیر خواہی کے صلہ میں محفوظ تھے، مثلاً شیخ تراب علی کا مکان میر عاشق کے کوچہ میں اور رائے سدا سکھ لال کا مکان ترکمان دروازہ میں۔ ان لوگوں کو شہر میں رہنے کے سارٹیفکٹ مل گئے تھے، مگر یہ سارٹیفکٹ ان کو شہر میں رہنے کی اجازت دیتے تھے، لوٹ مار کا خوف ان سے دور نہ ہوتا تھا کیونکہ جاہل سپاہی جو لوٹ کے شوقین تھے سرکاری اسناد کی بہت کم پروا کرتے تھے۔

میرزا غالب اور میر بدرالدین مُہر کن بھی گرفتار ہو کر کرنل برن حاکم شہر کے سامنے پیش ہوئے تھے مگر جب انھوں نے سرکاری اسناد دکھائیں اور غدر سے اپنی بے تعلقی ظاہر کی تو ان کو شہر میں آباد رہنے کی اجازت مل گئی۔ اسی طرح راجچندر

صاحب پروفیسر دہلی کالج کو بھی امان دیدی گئی۔

دردناک نظارہ

کرنل برن شہر کے فوجی گورنر بنائے گئے تھے اُنہوں نے چاندنی چوک میں قطب الدین سوداگر کی کوٹھی میں اقامت اختیار کی تھی، اور ایک دستہ فوج کا اس کام کے لئے مقرر کیا تھا کہ وہ جہاں آبادی پائے باشندوں کو گھروں کے اسباب سمیت گرفتار کر کے لے آئے، اس دستہ فوج نے اس حکم سے بہت ناجائز فائدہ اُٹھایا سپاہی بہت بیرحمی سے لوگوں کو پکڑ پکڑ کر لاتے تھے، مردوں کے سر پر گھر کا اسباب لادا جاتا تھا۔ عورتوں کو جبرًا ساتھ لیا جاتا تھا۔ آگے آگے مرد اسباب کے گٹھر سر پر رکھے ہوئے۔ پیچھے پیچھے اُن کی عورتیں زار و قطار روتی ہوئی۔ چھوٹے چھوٹے سہمے ہوئے بچوں کو گود میں لئے ہوئے۔ کسی عورت کی گود میں کبھی بچہ ہوتا تھا، اور پیدل بھی کئی کئی بچے انگلی یا چادر کا آنچل پکڑے ساتھ ہوتے تھے، وہ شریف زادیاں پیدل چلنے کی عادی نہ تھیں، خصوصًا اس حال میں کہ بچوں کا ساتھ۔ بے پردگی کی حالت۔ بچاریاں ٹھوکریں کھا کھا کر گرتی تھیں۔ بچے گود سے گرے جاتے تھے اور سپاہی ناقابل بیان سختی سے اُن کو آگے چلنے کے لئے دھکے دیتے تھے، اور ان کو ان مصیبت زدہ لوگوں پر ذرا رحم نہ آتا تھا۔

جب یہ لوگ کرنل برن کے سامنے پیش ہوتے تو حکم دیا جاتا کہ اسباب میں جسقدر قیمتی چیزیں ہیں اُن کو تلاش کر کے ضبط کر لو۔ بیکار چیزیں واپس دیدو جب اس حکم کی تعمیل ہو چکتی تو دوسرا حکم یہ دیا جاتا کہ ان کو فوجی حراست میں لاہوری دروازہ تک لیجاؤ اور شہر سے باہر نکال دو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوتا اور وہ لوگ لاہوری دروازہ کے باہر دھکے دیکر نکال دیے جاتے یہ تمام حالات منشی

ذکاء اللہ کی تاریخ میں ہیں)

خیال کرنے کی جگہ ہے کہ وہ غریب بال بچوں کو لیکر ایسی حالت میں کہ اُنکے پاس ایک پیسہ بھی کھانے کے لئے نہو کہاں جاتے ہوں گے اور اُنکے بچوں پر کیا گزرتی ہوگی؟ اس تکلیف کا اندازہ اسطرح ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص خود یہ تصور کرے کہ مجھ پر اور میرے اہل و عیال پر یہ حالات گزر رہے ہیں۔

غرض دہلی شہر کے باہر ہزاروں مرد اور عورتیں اور بچے بیکسی کے عالم میں ننگے پاؤں ننگے سر بھوکے پیاسے پھر رہے تھے اور کوئی اُنکا پرسانِ حال نہ تھا۔ نہ بیٹھنے کو جگہ تھی نہ دہوپ سے بچنے کو سایہ تھا، نہ پینے کو پانی کا گھونٹ میسّر تھا بعض نیکدل لوگوں نے چنے اُبال کر ان لوگوں کو تقسیم کرنے شروع کئے۔ پھر بھی اتنے زیادہ آدمیوں کا پیٹ بھرنا مشکل تھا، سینکڑوں بچے بھوک بھوک کہتے ہوئے ماؤنکی گودوں میں مر گئے، سینکڑوں مائیں چھوٹے بچوں کو اکیلا چھوڑ کر اس مصیبت سے نجات پانے کے لئے کنوؤں میں ڈوب مریں۔

ہزاروں عورتیں ڈوبکر مرگئیں

ہزاروں عورتیں ایسی تھیں کہ وہ گھر سے باہر نہ نکلیں؛ اور پردہ کے سبب اُنھوں نے گھر میں مرجانا قبول کیا اور جس وقت اُنھوں نے سُنا کہ فوج آتی ہے تو کنوؤں میں گرنے لگیں۔ اور اس کثرت سے گریں کہ ڈوبنے کو پانی نہ رہا یعنی کنوئیں اُنکی لاشوں سے بھر گئے، اور جب دوسری عورتیں اُن پر گریں تو چونکہ ڈوبنے کو پانی نہ تھا وہ لاشوں پر پڑی رہیں۔

ایک فوجی افسر کا بیان ہے کہ ہمنے اس قسم کی سیکڑوں عورتوں کو کنوؤں سے زندہ نکالا جو کنوئیں میں لاشوں کے سبب جگہ نہونے سے ڈوبی نہ تھیں اور زندہ پڑی تھیں۔

یا بیٹھی تھیں۔

جس وقت ہم نے اُن کو نکالنا چاہا تو وہ چیخنے لگیں کہ برائے خدا ہم کو ہاتھ نہ لگاؤ اور گولی سے مار ڈالو، ہم شریف بہو بیٹیاں ہیں، ہماری آبرو خراب نہ کرو۔ اور جب ہم اُن کو باہر نکالتے تھے تو وہ ڈر کے مارے تھر تھر کانپنے لگتی تھیں، اور بعض اُن میں بیہوش ہو کر گر پڑتی تھیں"

ایک کنوئیں سے کسی عورت کی لاش نکلی جس نے اپنے دو بچوں کو چھاتی سے باندھ لیا تھا، ایک بچہ چھ مہینے کا معلوم ہوتا تھا۔ دوسرا دو سال کے قریب تھا مرنے کے وقت وہ ان دونوں کو اپنے ہاتھوں سے دبا کر کلیجہ سے لگائے رہی ہوگی کیونکہ اُس کے دونوں ہاتھ بچوں کے اوپر چمٹے ہوئے تھے۔

فراشخانہ کے کسی کنوئیں میں دو عورتیں زندہ نکالی گئیں، ایک جوان تھی، مگر اندھی تھی، دوسری بڑھیا تھی، بڑھیا کے بیان سے معلوم ہوا کہ اس کا ایک ہی بیٹا تھا جسکو گھر میں گھس کر قتل کر دیا گیا، اور جب وہ قتل کیا جا رہا تھا چند سپاہیوں نے اُس کی اندھی بہن کی عصمت پر حملہ کرنا چاہا، مگر وہ اپنے گھر کے کنوئیں سے واقف تھی دوڑ کر اُس میں گر پڑی اور اُس کے ساتھ ہی میں بھی کنوئیں میں کود ی۔ ہم دونوں پانی میں غوطے کھا رہے تھے کہ کسی نے اندر آ کر ہم کو باہر نکالا۔

ایک مسلمان گرفتار ہو کر آیا اور اُس نے بیان کیا کہ جب میں نے حالت نازک دیکھی تو اپنے ہاتھ سے اپنی بیوی اور بہو اور جوان بیٹی کو قتل کر دیا۔ کیونکہ مجھے اُن کے بے آبرو ہونے کا اندیشہ تھا، اس کے بعد بندوق لیکر لڑنے نکلا اور گرفتار ہوا حاکم نے اُس کا بیان سُنکر حکم دیا کہ اس کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے چنانچہ اُس کو پھانسی دیدی گئی ؛

———— ؛ ————

مُسلمان چُن چُن کر مارے جاتے تھے

غدر کی ابتدا خواہ کسی فرقہ کی طرف سے ہوئی ہو، مگر مُسلمان بادشاہ کی سرپرستی اور مُسلمان قوم کی عملی سرگرمی کے سبب زیادہ قصوروار مُسلمان ہی سمجھے جاتے تھے اور دہلی لینے کے بعد سب سے زیادہ مُسلمان ہی چُن چُن کر قتل کیے جا رہے تھے وہ دوہری مار کا شکار تھے، ایک طرف تو انگریز ان سے ناراض تھے اور دوسری طرف سکھ سپاہی اپنا پُرانا غصہ ان پر اُتارنا چاہتے تھے، کیونکہ ان کے گرو تیغ بہادر صاحب کو کسی مُسلمان بادشاہ نے دہلی میں قتل کیا تھا اور سکھوں کو اس تاریخی قتل کا انتقام مُسلمانوں سے لینا تھا۔ اس واسطے سکھ سپاہی جہاں کہیں کسی جوان اور خوبصورت مُسلمان کو دیکھتے مار ڈالتے تھے، منشی ذکاءاللہ صاحب نے لکھا ہے کہ سکھوں کے ہاتھ سے تمام شہر کے خوبصورت اور جوان مُسلمانوں کا خاتمہ ہو گیا، وہ بوڑھے باپ کے سامنے اُس کے جوان بیٹوں کو قتل کر ڈالتے تھے اور باپ کو رنج اُٹھانے کے لئے زندہ چھوڑ دیتے تھے۔

جب پہلے پہل انگریزی فوج شہر میں داخل ہوئی اُسوقت تو جو سامنے آتا تھا گولی سے مار ڈالا جاتا تھا، ہندو مُسلمان کی تخصیص نہ تھی، مگر بعد میں صرف مُسلمان ہی چُن چُن کر مارے جاتے تھے، (تاریخ ہند صفحہ ۷۰۵)

کوچہ چیلان کی مصیبت

دہلی کے تمام محلوں سے زیادہ چیلوں کے کوچہ پر مصیبت آئی تھی، اس محلہ میں بڑے بڑے شرفا اور نامور علماء رہتے تھے۔ مولانا شاہ ولی اللہ و شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا گھرانا اسی محلہ میں آباد تھا۔ سرسید احمد خان کا گھر بھی اسی محلہ کے

ایک حصہ میں تھا، مولانا صہبائی بھی اسی محلہ میں رہتے تھے، غرض یہ محلہ بڑے بڑے صاحب کمال لوگوں کا مخزن تھا، منشی ذکاءاللہ صاحب بھی اسی محلہ کے باشندے تھے، اور اب بھی انکے لڑکے اسی محلہ میں آباد ہیں، مگر غدر کے وقت منشی صاحب شہر کے باہر چلے گئے تھے اور سر سید بھی اپنے کنبہ سمیت دہلی میں نہ تھے۔

منشی ذکاءاللہ صاحب لکھتے ہیں" اس مصیبت خاص کا سبب یہ ہوا کہ نواب شمشیر جنگ خان کے بیٹے محمد علی خان اور یا حکیم فتح اللہ خان نے کسی انگریزی سپاہی کو زخمی کر دیا تھا، کیونکہ وہ اُن کے زنانہ مکان میں بُرے ارادہ سے جانا چاہتا تھا۔ اس کی خبر انگریزی کمان افسر کو ہوئی تو اُس نے حکم دیا کہ اس کوچہ کے تمام مردوں کو قتل کر دو یا گرفتار کر کے لے آؤ۔

اس حکم کی تعمیل ایسی بیدردی سے ہوئی کہ محلہ میں کوئی مرد زندہ نہ بچا۔ یا تو سپاہیوں نے گھروں میں گھسکر مار ڈالا یا گرفتار کر کے حاکم کے سامنے لے گئے۔ حاکم نے اُن کو دیکھ کر حکم دیا کہ سب کو دریا کے کنارے لیجاؤ اور گولی مار دو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

ان لوگوں کو رسی سے باندھا گیا، دریا کی ریتی میں قطار بنا کر کھڑا کیا گیا اور گولیوں کی باڑھ ان پر چلائی گئی جس سے سب مر کر گر پڑے۔ صرف دو آدمی زندہ بچے، جن کے گولی نہ لگی تھی، جب سپاہی گولیاں مار کر چلے گئے تو یہ دونوں اُٹھکر بھاگے، ان میں ایک مرزا مصطفیٰ بیگ تھے جو بعد میں رسالہ میں نوکر ہو گئے تھے اور دوسرے مولانا صہبائی کے داماد اور بھانجے وزیرالدین نامی تھے جو بعد میں کانپور ججی کے سر رشتہ دار ہو گئے تھے۔

مقتولوں میں ہندوستان کے آفتاب و ماہتاب

ان مقتولوں میں ہندوستان کے دو چاند سورج بھی تھے، ایک مولانا صہبائی جن کی

فارسی دانی تمام ہندوستان میں مسلم تھی، اوران سے زیادہ فارسی علم کا جاننے والا تمام ملک میں کوئی نہ تھا، میرزا غالب کے رقعات میں مولانا صہبائی کا بڑے دردانگیز الفاظ سے ذکر ہے۔ اور غالب ان کے کمالات کے بڑے قدر دان تھے مفتی اعظم مفتی صدرالدین آزادہ نے مولانا صہبائی کے قتل کی خبر سُنی تو شعر کہا:۔

قتل اس طرح سے بیجرم جو صہبائی ہو — کیونکہ آزردہ نکلجائے نہ سودائی ہو۔

مقتولوں میں دوسرے نامور شخص سید محمد امیر عرف میر پنجہ کش تھے، جن کی خوشنویسی کا لوہا تمام ہندوستان مانتا تھا، اوران کے ہاتھ کے لکھے ہوئے حروف سونے چاندی کے عوض خریدے جاتے تھے۔ وہ بھکاری فقیروں کو ایک حرف لکھکر دیدیتے تھے، جو ایک روپیہ کے نوٹ کی طرح ہر جگہ روپیہ کو بکجاتا تھا، افسوس کہ یہ صاحب کمال بھی دریا کی ریتی میں مارا گیا۔

چیلوں کے کوچہ والے جو دریا کی ریتی میں بیجا ہلاک کیے گئے اُن کی تعداد کا صحیح علم کسی کو نہیں، مگر اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ صرف مولانا صہبائی کے کنبہ کے اکیس آدمی اس قطار میں مارے گئے، تو ظاہر ہے کہ جب ایک شخص کے ہمراہ ہی اکیس تھے تو باقی اور بڑے آدمیوں کے ساتھی کتنے کتنے ہوں گے۔

صرف مسلمانوں کو باغی سمجھا جاتا تھا

ایک ڈاکٹر صاحب کا ذکر تاریخ ہند میں ہے جنکا نام منشی ذکاء اللہ صاحب نے نہیں لکھا ہے، وہ صرف مسلمانوں کو باغی سمجھتے تھے، جب کسی سے ملتے تو پوچھتے کہ تو مسلمان ہے یا ہندو؟ اگر وہ ہندو کہتا تو جانے دیتے، اور مسلمان کہتا تو مار ڈالتے۔ ایک دوست نے اُن کو اس غلطی سے آگاہ کیا کہ بغاوت میں دونوں قومیں شریک تھیں تب اُنھوں نے مسلم کشی سے ہاتھ اُٹھایا۔

گولی سے کتنے آدمی مارے گئے

انگریزی تاریخوں میں صرف گولی سے مارے جانیوالوں کی تعداد ننو آٹھ سو لکھی ہے مگر مرنیوالوں کا شمار ایسی افراتفری اور عام پریشانی کے وقت کون کیا کرتا ہے۔ مردم شماری میں زندہ آدمیوں کے شمار کے لیئے تو ایک خاص محکمہ بنایا جاتا ہے۔ مردہ آدمیوں کا گننا اور پھر اُن کو قلم بند کرنا بالکل خلاف قیاس بات ہی معلوم نہیں کتنے مر گئے، اور کس قدر مارے گئے، ان کی گنتی معلوم بھی ہو تو کیا فائدہ ہو گا؟

لارڈ رابرٹس فیلڈ مارشل کی کتاب تاریخ چہل و یک سالہ میں ایک نظارہ دہلی کے مرنے والوں کا درج ہے، اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ کس کثرت سے لوگ مارے گئے تھے۔ لارڈ موصوف نے صرف ایک دن کا نظارہ دکھایا ہے، اور خونریزی تو خبر نہیں کتنے دن قائم رہی تھی، وہ لکھتے ہیں:-

"ہم صبح کو لاہوری دروازہ سے چاندنی چوک میں گئے، تو ہم کو شہر حقیقت میں مُردوں کا شہر نظر آتا تھا، کوئی آواز سوائے ہمارے گھوڑوں کی ٹاپوں کے سُنائی نہیں دیتی تھی، کوئی زندہ آدمی نظر نہیں آیا، سب طرف مُردوں کا بچھونا بچھا ہوا تھا، جس میں بعض حالت نزع و جاں کنی میں مبتلا تھے۔

ہم چل رہے تھے تو بہت آہستہ آہستہ بات کرتے تھے خوف تھا کہ ہماری آواز سے مُردے نہ چونک پڑیں، اس بات کے دیکھنے سے کہ ایک طرف مُردوں کی لاشوں کو کُتّے کھا رہے ہیں اور دوسری طرف لاشوں کے آس پاس گدھ جمع ہیں جو اُن کے گوشت کو نوچ نوچ کر مزے سے کھا رہے ہیں اور ہماری آمد کی آواز سے اُڑ اُڑ کر تھوڑے فاصلہ پر

جا بیٹھتے ہیں ہم کو بڑی عبرت ہوتی تھی، اور ہمارا دل رنجور ہو جاتا
تھا، بہت سے مُردے ایسے پڑے تھے گویا وہ زندہ ہیں۔
بعض مُردوں کے ہاتھ اوپر کو اُٹھے ہوئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا
کہ وہ کسی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔
غرض ان مُردوں کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی، جیسے کہ ہم کو ان کے
دیکھنے سے ڈر لگتا تھا ویسے ہی ہمارے گھوڑے ان کو دیکھ کر
ڈر کے مارے بدکتے اور ہنہناتے تھے، مُردوں کی لاشیں پڑی سڑتی
تھیں۔ اُن کے تعفن سے ہوا میں بیمار کرنیوالی بدبو اُٹھ رہی تھی۔"
اسی طرح ایک اور رحمدل انگریز نے دہلی کی حالت پر نہایت سادہ مگر موثر
الفاظ میں لکھا ہے:۔
دِلّی کے باشندے اگرچہ سب نہیں مگر آدھے بے قصور شہر کے گرد و
نواح۔ دیہات و جنگلوں میں پڑے ہوئے ہلاک ہو رہے ہیں"
لارڈ رابرٹس جنگی آدمی تھے، مگر اُنھوں نے شاعروں کی طرح ایسا صحیح اور دردناک
منظر دہلی کے بازار کا لکھ کر پیش کیا ہے جس کو پڑھ کر کلیجہ شق ہوا جاتا ہے، اور
معلوم ہوتا ہے کہ دہلی میں اس شدت سے لوگ مارے گئے تھے کہ بازار لاشوں سے
بھرے پڑے تھے، پھر جو انگریزی تاریخوں میں صرف سولہ سو آدمیوں کا لی سے
مارا جانا لکھا گیا ہے اُسپر کیونکر یقین کیا جا سکتا ہے۔
بہرحال دہلی میں جس قدر لوگ مارے گئے اُن میں کم از کم آدھا حصہ اور عورتوں کا
پورا حصہ محض بیگناہ تھا، اور ناعاقبت اندیش باغیوں کی حرکات ناشائستہ کے
وبال میں یہ مظلوم خواہ مخواہ موت کے گھاٹ اُتارے گئے۔

بیمار کی پھانسی

مرنے کے بعد بھی بیماری کا اثر موجود تھا

انگریزوں کی خطا نہیں بعض ہندوستانی جھوٹ بول بولکر انگریزوں سے ظلم کراتے تھے، بہادر شاہ کے بھائی میرزا بابر کا لڑکا میرزا کالے مخبروں میں نوکر ہوگیا تھا، اُس نے اپنے خاندان والوں پر ایسے ایسے ظلم کرائے جن کے سُننے سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، وہ اپنی کارگزاری کھانے کو ایسے ایسے جھوٹ بولتا تھا جنکا کچھ بھی سر پیر نہ ہوتا تھا، معمولی شہزادوں کو گرفتار کراتا اور اُن سے کہدیتا کہ صاحب کے سامنے جاکر کہدینا کہ ہم بادشاہ کے قریبی رشتہ دار ہیں، اگر تم یہ کہوگے تو تم کو بادشاہ کے ساتھ رکھا جائے گا اور تمہاری پنشن مقرر ہو جائے گی۔

دوسری طرف حکام سے جاکر کہتا کہ میں نے فلاں شہزادہ کو گرفتار کرایا ہے جو بادشاہ کا ایسا قریبی رشتہ دار ہے، اور جسنے غدر میں انگریزوں کے خلاف بڑے بڑے کام کیے ہیں، اور ایسے شخص کا گرفتار کرانا معمولی بات نہ تھی۔

حکام اس کی باتوں سے دہوکے میں آجاتے تھے، اور بچارے شہزادونکو بے گناہ پھانسیاں ہو جاتی تھیں۔

انہی بے خطا شہزادوں میں ایک شہزادہ میرزا قیصر نامی تھی جو بہادر شاہ کے دادا شاہ عالم کے بیٹے تھے، وہ اس قدر بوڑہے تھے کہ اُن کے ہوش حواس بھی درست نہ تھے، اور کوئی شخص یہ خیال بھی نہیں کرسکتا تھا کہ انہوں نے غدر میں کوئی حصہ لیا ہوگا، مگر موذی عقرب صفت مخبر نے انگریز حکام کو میرزا

قیصر کی طرف سے ایسی ایسی بے سروپا باتیں سُنائیں کہ حکام آگ بگولہ ہو گئے اور غریب بوڑھے شہزادہ کو پھانسی دیدی گئی۔

اسی طرح ایک اور بیمار شہزادہ میرزا محمود شاہ نامی تھا۔ یہ اکبر شاہ کا پوتا اور عرصہ دراز سے گٹھیا کے مرض میں مبتلا تھا۔ غدر کے زمانہ میں بچارا گھر میں بے حس وحرکت پڑا رہتا تھا، گٹھیا کے سبب اس کے ہاتھ پاؤں ایسے اکڑ گئے تھے کہ وہ گولا لاٹھی اور گول مٹول ہو گیا تھا، اس آفت نصیب کی شکایت بھی نون مرچ لگا کر مخبر نے حکام سے جا کر کی اور اسکے بیان سے متاثر ہو کر میرزا محمود شاہ کو بھی پھانسی دیدی گئی۔ منشی ذکاءاللہ لکھتے ہیں پھانسی پانے کے بعد بھی میرزا محمود شاہ کی لاش گولا لاٹھی بنی لٹکتی رہی اور جو شخص اس لاش کو دیکھتا تھا اور اس کی بیماری کا خیال کرتا تھا تو رنج و افسوس سے بے اختیار رونے لگتا تھا۔

سب انگریز بے رحم نہ تھے

جس شہر میں یہ بے رحمیاں ہو رہی تھیں اُسی شہر میں ایسے رحمدل انگریز بھی تھے جو بے گناہوں کی حمایت کرتے تھے، اور لاوارثوں کے وارث بنکر ان کی طرف سے حکام کے پاس سفارشیں لیجاتے تھے، بیماروں اور زخمیوں کو ہسپتال بھجواتے اپنے پاس سے بھوکوں، محتاجوں کو کھانا دیتے اور کوشش کرتے تھے کہ حکام دہلی سے بے گناہ لوگوں کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہونے پائے۔ مگر ان کی کوشش دو وجہ سے اکثر ناکام رہتی تھی، ایک تو یہ کہ اختیارات عموماً ان انگریزوں کے ہاتھ میں تھے، جنکے بال بچے باغیوں کے ہاتھ سے بیگناہ مارے گئے تھے، اور اُن کے گھروں کو لوٹا گیا تھا اور اُن کو رہ رہکر اپنے گھروں کی تباہی اور اپنے بچوں اور عورتوں کا بےکسی و ظلم سے مارا جانا یاد آتا تھا اور اس یاد کے سبب غم و غصہ انکی

عقل پر پردے ڈال دیتا تھا، اور وہ حق و ناحق میں اچھی طرح تمیز نہ کر سکتے تھے
اور دوسری وجہ یہ تھی کہ خود مخبروں نے سفاکی پر کمر باندھ لی تھی، یہ جاسوس اور مخبر
کے رہنے والے تھے، اور اپنی ناموری اور افسروں کی خوشنودی حاصل کرنے کو
ح طرح کے فرضی قصے تصنیف کرتے تھے، ان میں سے بعض تو خود بغاوت میں
شریک رہ چکے تھے، مگر اب دوسروں کو باغی ثابت کرنے کا بیڑا اُٹھایا تھا، اور
اس طرح اپنی جان بھی بچانی چاہتے تھے، اور روپیہ کمانا بھی مقصود تھا۔

گامی خان مخبر کی بہت دھوم تھی، وہ غدر میں باغیوں کے ساتھ تھا پھر
انگریزوں سے آملا اور سیکڑوں بے گناہوں کو پھانسی پر لٹکوا دیا۔ سینکڑوں
گھر اُجاڑ دیئے، اور بے شمار جھوٹی اطلاعیں حکام کو دیں۔ گامی کی ہیبت
مٹکاف صاحب سے بھی زیادہ تھی۔ لوگ گامی کا نام سُن کر کانپ جاتے تھے
آخر کاغذ کی ناؤ کے ڈوبنے کا وقت آیا اور میاں گامی کے کرتوت کھل گئے
تو حکام نے اس دغا باز کو بھی پھانسی دیدی۔

میرزا کالے کے علاوہ ایک اور مخبر غلام فخر الدین نامی تھا۔ اس نے بھی
اپنے شہر والوں کو ستانے اور پھانسیاں دلوانے میں کمی نہیں کی۔

غرض سب انگریز بے رحم نہیں تھے، سوائے چند مخصوص لوگوں کے جن میں مٹکاف
صاحب اور ہڈسن صاحب بہت نامور ہوئے، اور کوئی انگریز بھی حد سے زیادہ
ظلم و ستم کا حامی نہ تھا۔

سر جان لارنس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے، کہ اُنھوں نے اس قیامت
کے وقت دہلی اور اُس کے شریف باشندوں کی اپنی زوردار تحریروں میں ہمیشہ
حمایت کی، اور کوئی دقیقہ اس میں باقی نہ رکھا، گو برسر اقتدار حکام دہلی اُن کے
لکھنے پر بہت کم عمل کرتے تھے اور کہہ دیتے تھے کہ ایسے وقت نرمی نہ کرنی چاہیئے۔

بلکہ اپنی قوت کو اچھی طرح ظاہر کرنا ضروری ہے۔

شہزادوں کا جیلخانے میں مرنا

جن شہزادوں کو قید کی سزا دی جاتی تھی اُن کی مشقت موت سے زیادہ سخت ہوتی تھی، اوّل تو وہ مشقت کے عادی نہ تھے، دوسرے کام بھی ان کی بساط اور طاقت سے زیادہ لیا جاتا تھا، اُن کو چکی پیسنے کی عادت نہ تھی جب زیادہ مقدار میں آٹا پسوایا جاتا اور نہ پستا تو ان پر کوڑوں کی مار پڑتی، یہاں تک کہ وہ بیچارے چند ہی روز میں مار کھا کر قید ہستی سے رہا ہو جاتے۔

شہزادوں کا آخری زمانہ ایسی عیش پسندی کا تھا کہ وہ عہدی بندے ہو گئے تھے، وہ نوکر اور لونڈی غلام کی مدد کے بغیر پانی بھی نہ پی سکتے تھے۔ یکایک اتنا بڑا انقلاب ان سے کیونکر برداشت ہوتا کہ چکی چلا کر آٹا پیستے دو چار ہی ہاتھ چلانے سے ان کے ہاتھوں میں چھالے پڑ جاتے تھے، بازو شل ہو کر کام کرنے سے جواب دیدیتے تھے۔ جیل کے برقنداز تو ہر جگہ دوزخ کے فرشتے ہوتے ہیں وہ ان نازک بدنوں پر ذرا رحم نہ کرتے تھے اور اس قدر کوڑے ان کے مارتے تھے کہ یہ غریب مار کھاتے کھاتے بیہوش ہو جاتے تھے اور یہ تھا اُس سرکشی کا نتیجہ جو ان غریبوں کو بغیر کسی عمل کے بھگتنا پڑا۔

وہی مثل ہے کرے ڈاڑھی والا پکڑا جائے مونچھوں والا۔ بغاوت فوج نے کی، گرفت شہزادوں اور باشندگان شہر کی ہوئی۔ اگرچہ شہزادوں اور شہریوں میں بھی بعض لوگ قصوروار تھے، مگر سب خطاکار نہ تھے اور سزا بلاامتیاز سب کو دی جاتی تھی۔

والیان ریاست کو پھانسیاں

دہلی کی ایجنسی میں سات ریاستیں تھیں ، جھجر - پاٹودی - دوجانہ - لہارو - بلب گڑھ - فرخ نگر - بہادر گڑھ دادری -

جھجر کے نواب عبدالرحمن خاں پر یہ جرم عائد کیا گیا کہ انہوں نے سر تھیوفلس مٹکاف صاحب کو پناہ نہ دی جبکہ وہ اُن کے پاس باغیوں سے بھاگ کر گئے تھے اور بہادر شاہ کو عرضیاں بھیجیں ، اس لیئے ۲۰ / اکتوبر کو فوج جھجر گئی اور نواب صاحب کو گرفتار کر لائی - قلعہ کے دیوانِ عام میں چندر روز قید رہے - مقدمہ ہوا - اور آخر پھانسی کی سزا دی گئی اور ریاست ضبط ہوئی -

بلب گڑھ کے راجہ ناہر سنگھ پر یہ جرم عائد ہوا کہ اس نے منٹرو صاحب وکیل رزیڈنٹی کی جان نہ بچائی اور وہ اس کے علاقہ میں باغیوں کے ہاتھ سے مارے گئے ، نیز اس نے بادشاہ کو بہت سی عرضیاں لکھیں ، اس کو بھی پھانسی کی سزا دی گئی اور ریاست ضبط -

فرخ نگر کے نواب احمد علی خاں کو پھانسی اور ضبطی ریاست کی سزا ملی -

لہارو کے رئیس نواب امین الدین خاں اور نواب ضیاء الدین خاں کچھ دن قید رہے - مقدمہ میں کئی کئی گھنٹے کھڑا رہنا پڑا - آخر سر جان لارنس کی کوشش سے رہائی پائی اور ریاست بھی بحال رہی -

پاٹودی اور دوجانہ پر کوئی جرم عائد نہیں ہوا - بہادر گڑھ دادری کے رئیس بہادر جنگ خاں پھانسی سے تو بچ گئے ، مگر ریاست ضبط ہوئی - اور لاہور میں رہنے کا حکم ملا - اور ہزار یا پانسو روپئے ماہوار پنشن مقرر ہوئی -

پھانسی کا منظر

جب جھجر۔ بلب گڑھ۔ فرخ نگر کے رئیسوں کو پھانسیاں دی جاتیں، تو شہر کے سب دروازے بند ہو جاتے، تیسرے پہر کا وقت ہوتا۔ فوج باجہ بجاتی ہوئی آتی، اور پھانسی گھر کے سامنے آکر ٹھہر جاتی، پھر قلعہ سے پھانسی پانے والے مجرم کو ایک کراچی میں لایا جاتا، جس کے گرد گھیرا ہوتا تھا مجرم کے ہاتھ پیٹھ کی طرف بندھے ہوئے ہوتے تھے، کوتوالی کے چاروں طرف انگریز تماشائی جمع ہوتے تھے، جب پھانسی کا تختہ کھینچا جاتا تو تماشائی ہنستے، اس کے بعد لاش اوندھے منہ کراچی میں ڈال دی جاتی، اور شہر کے باہر کسی جگہ دفن کرنے کو بھیجدی جاتی تھی۔

پھانسی پانے والوں کی کئی قسمیں تھیں، ایک تو وہ لوگ تھے جو بادشاہ سے تعلق خاص رکھتے تھے یا اُن کے نوکر تھے اور انہوں نے قلعہ کے مقتول انگریزوں اور عورتوں بچوں کے قتل میں حصہ لیا تھا، اور دوسرے وہ تھے جنہوں نے جہاد کے نام سے لڑائی میں حصہ لیا تھا اور اب مسجدوں میں بیمار یا زخمی پڑے تھے، تیسرے وہ تھے جنہوں نے میگزین میں انگریزوں کو دق کیا تھا، چوتھے باغی سپاہی تھے جو چھپے چھپائے کہیں نہ کہیں سے دستیاب ہو جاتے تھے، پانچویں اجمیری دروازہ کے مسلمان موچی تھے جنہوں نے مٹکاف صاحب پر بانسوں سے حملہ کیا تھا، جبکہ وہ باغیوں سے بھاگ کر اجمیری دروازے کی طرف سے شہر کے باہر جانا چاہتے تھے، چھٹے وہ میواتی اور گوجر تھے جنہوں نے چاروں طرف لوٹ مچا رکھی تھی۔

کوتوالی چاندنی چوک کے سامنے ایک حوض تھا جو اب بند ہو گیا ہے اُس کے

تین طرف پھانسیاں گڑی ہوئی تھیں۔

بہت نامناسب کام!

پھانسی دینے کے وقت ایک بات بہت نامناسب پائی جاتی تھی، کہ پھانسی پانے والوں کی ایک قطار لاکر کھڑی کی جاتی تھی، اُس میں سے آدھے پھانسی پر لٹکا دیے جاتے اور آدھے کھڑے ہوئے دیکھتے رہتے کہ اس کے بعد ہمارا نمبر آئیگا، مہذب قوموں کے ہاں یہ بات بہت نامناسب اور عیب سمجھی جاتی ہے،

دہلی کے بعض شرفا الور کی ریاست میں بڑے بڑے عہدوں پر مامور تھے۔ جب دہلی میں گرفتاریاں اور قتل کاریاں ہوئیں تو صدہا عمائد و شرفا بھاگ بھاگ کر الور پہنچے، اُن کا خیال تھا کہ الور میں ہم کو امن اور پناہ مل جائیگی مگر غلام فخر الدین خان جاسوس موت کا فرشتہ بنکر الور پہنچا اور ایک ایک کو چُنکر گرفتار کرلایا، کچھ تو گڑگانوہ کے مجسٹریٹ کے حکم سے راستہ میں درختوں پر لٹکادیے گئے، اور باقی دہلی لائے گئے اور یہاں اُن کو پھانسیاں دی گئیں۔

بوڑھی مائیں بیٹوں کی موت دیکھنے آئیں

تاریخ ہند میں لکھا ہے کہ جسوقت الور کے قیدی پکڑے ہوئے آئے اور اُن کو پھانسی کا حکم دیا گیا اور اُن کی پھانسی کا وقت آیا تو قیدیوں میں سے چار جوانوں کی بوڑھی مائیں بھی اُن کی موت کا تماشہ دیکھنے آگئیں، یہ جوان زرق برق کپڑے پہنے ہوئے تھے، سر پر ریشمی اور زریں سیلے بندھے ہوئے تھے، پیروں میں ٹاٹ بانی جوتیاں، چست انگرکھے، چوڑے چوڑے سینے۔ گورے

گورے چہرے۔

جس وقت حلال خور نے ان کو پھانسی کے تختے پر کھڑا کیا، ان کی بڑھیا ماؤں کا غم کے مارے عجیب حال تھا، وہ چیخیں مارتی تھیں، پچھاڑیں کھاتی تھیں۔ اور کلیجہ پکڑ کے زمین پر لوٹ جاتی تھیں، اور اُن کے بیٹے دم بخود چپ چاپ اپنی ضعیف ماؤں کی بیقراری دیکھ رہے تھے، دیکھتے دیکھتے تختہ کھینچ گیا اور وہ موت کے پھندے میں لٹکنے لگے۔

اس دن حلال خور نہال ہو گیا تھا، کیونکہ زریں سیلوں اور ناٹ بافی جوتیوں کا ایک انبار اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

دہلی میں ایک رئیس نواب محمد حسن خاں نامی تھے انھوں نے ایک میم کو اپنے گھر میں پناہ دینے کی نیکی کے ساتھ ایک بُرائی یہ کی کہ میم صاحبہ کی آبرو خراب کر ڈالی جس سے اُن کو حمل ہو گیا، اس جرم میں نواب صاحب کو بھی پھانسی دی گئی۔ مگر میم نے یہ شرافت برتی کہ نواب صاحب کی بیوی کے مال اسباب کو لوٹے سے بچا دیا اور اپنے پاس سے بھی نقدی دیکر گزارہ کا سامان کر دیا۔

سر جان لارنس کی لائف میں لکھا ہے کہ جس جگہ پھانسیاں دی جاتی تھیں وہاں ایک دیسی دوکاندار کرسیاں بچھاتا تھا اور اُن پر انگریز افسر آکر بیٹھتے تھے اور دوکاندار کو کرسیوں کا کرایہ دیتے تھے۔ وہاں یہ لوگ پھانسی کا تماشہ دیکھتے۔ چرٹ پیتے، اور مرنے کی آخری سیر کرتے تھے، اگر کوئی میم ادہر گزرتی تو وہ پھانسی کا منظر نہ دیکھ سکتی اور ٹوپی سے اپنی آنکھوں اور چہرہ کے سامنے آڑ کر لیتی تھی۔

مسلمانوں کے لئے ایک جرم یہ بھی تھا کہ ان کی شان سپاہیانہ ہے یا نہیں؟ اگر کسی مسلمان کی شان سپاہیانہ ہوتی تو پھانسی دینے کا ایک بڑا سبب یہی ہو جاتا

تھا، تاریخ ہند میں ہے کہ ایک روز بارہ مسلمان گرفتار ہو کر آئے اُن کا کوئی
جُرم ثابت نہ ہوا تو اس خطا پر اُن کو پھانسی دیدی گئی کہ ان کی صورت سپاہیانہ
ہے اور وہ ضرور بغاوت میں شریک ہوئے ہوں گے۔
غدر سے پہلے تمام مُسلمان حتیٰ کہ علماء اور درویش بھی سپاہیانہ وضع رکھتے تھے،
حضرت مولانا فخرالدین فخر صاحب نے تمام عمر سپاہیانہ وضع رکھی، مگر غدر کے بعد
یہ مجرم ہونے کی علامت تھی۔

امراو شرفا حوالات میں

نواب حامد علی خاں، حکیم احسن اللہ خاں، نواب احمد قلی خاں، سید سردار مرزا
مفتی صدرالدین وغیرہ نامور امراو شرفا مدتوں حوالات میں رہے، ان میں بعض
امیرزادے ایسے بے فکرے تھے کہ شطرنج، گنجفہ، چوسر کے کھیل میں مصروف
رہتے، حالانکہ ان میں سے روزانہ ایک دو آدمیوں کو پھانسیاں ہوتی تھیں،
مگر ان کے لہو و لعب کا شوق اس کے باوجود باقی تھا۔
مٹکاف صاحب کو ایک دن خبر ملی کہ حکیم محمود خاں صاحب کے مکان میں بہت
سے باغی پوشیدہ ہیں، وہ فوج لیکر گئے اور سب کو ایک رسہ کے حلقہ میں
گرفتار کر کے کوتوالی لے آئے۔ حکیم محمود خاں بھی مروّت و شرافت کے سبب
گرفتار شدہ لوگوں کے ساتھ کوتوالی چلے گئے، شہر میں چرچا ہوا کہ حکیم صاحب
بھی گرفتار ہوئے، مگر وہ اپنی خوشی سے گئے تھے، رات بھر کوتوالی میں رہے
صبح کو چلے آئے، اور اُن کی کوشش سے وہ سب قیدی بھی چھوٹ گئے جو
ان کے مکان سے گرفتار ہوئے تھے۔
شہر کے آس پاس درگاہ قدم شریف اور عرب سرائے۔ پرانے قلعہ اور

درگاہ سلطان جی صاحب میں جو لوگ بھاگ کر چلے گئے تھے، ان کی تلاش کے لیئے سر مٹکاف روزانہ فوج لیکر جاتے تھے اور رسہ کے حلقے میں گھیر لاتے تھے، گھیرا پڑنے کی جگہ جگہ ہیبت چھائی ہوئی تھی، ان قیدیوں کو قید و جُرمانہ کی سزائیں ملتی تھیں، مگر مسلمانوں کے پاس جرمانہ دینے کو کچھ باقی نہ تھا اس لیئے وہ عموماً قید کیئے جاتے تھے۔

شہزادہ امیر الملک کا بیان!

اس کتاب کی تحریر کے وقت میں شہزادہ میرزا امیر الملک عرف میرزا بلاقی سے ملا، اور اُن سے تاریخی باتوں کی تصدیق چاہی، کیونکہ وہ غدر میں موجود تھے اور آج کل چاندنی محل کے محلہ میں رہتے ہیں،

اُنھوں نے کہا کہ میرزا قیصر کی پھانسی کا قصہ سچا نہیں معلوم ہوتا کیونکہ وہ غدر کے بعد تک زندہ رہے، اور اپنی موت سے مرے۔ مگر یہ واقعہ منشی ذکاء اللہ صاحب نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے، ممکن ہے میرزا بلاقی صاحب کو پورا علم نہ ہو۔

میرزا بلاقی صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ گامی خاں مخبر کا بڑا خوف لگا رہتا تھا میں اپنی والدہ کے ساتھ درگاہ حضرت سلطان جی کے قریب ایک مقبرہ میں تھا کہ ایک نوکر آیا اور اماں سے کہا کہ گامی خاں کہتے تھے کہ یہ لڑکا (میرزا بلاقی) بہادر شاہ سے خوشخطی سیکھا کرتا تھا، مجھے اسکا حال معلوم ہے، پس یہ سنتے ہی والدہ ڈر گئیں اور جب اُنھوں نے یہ سُنا کہ گامی خان درگاہ میں آیا ہوا ہے تو اُنھوں نے مجھ کو تو چارپائی کی ادوان پر لٹا کر رضائی میرے اوپر اس طرح ڈالدی گویا بچھونا رکھا ہے اور نوکر کو سونے کی بالیاں اُتار کر دیں کہ یہ گامی کو دیدو اور کہدو کہ میرے بچّہ کی مخبری نہ کرے، میرزا صاحب کہتے ہیں کہ میں

شام تک اسی طرح پڑا رہا۔
اُن کا یہ بیان بھی قابل تحریر ہے کہ ہم لوگ بادشاہ کے آنے سے پہلے درگاہ سلطان جی صاحب میں آ گئے تھے۔ جب خبر ملی کہ بادشاہ مقبرہ ہمایونمیں آ گئے ہیں تو میں نوکر کے ساتھ والدہ کے کہنے کے بموجب اُن کو سلام کرنے گیا۔ بہادر شاہ اُس وقت ہمایوں کی قبر سے تکیہ لگائے بیٹھے تھے ہیں نے جا کر سلام کیا تو گھبرا کر فرمایا "بھئی اماں! تم یہاں کہاں؟ لو یہ تمہارے خوان کے روپئے ہیں۔ لو۔ اور ابھی چلے جاؤ۔ جیتے بچے تو پھر ملیں گے"۔
مجکو بادشاہ کے ہاں سے کھانے کا خوان ملا کرتا تھا، اس کے عوض بادشاہ نے پانچ روپئے مجکو دیئے اور رخصت کر دیا۔

میرزا قویاش کی تلاش

میرزا بلاقی صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ جب خوف زیادہ بڑھا تو والدہ ہم سب کو لیکر رتھ میں سوار ہوئیں اور قطب صاحب لے چلیں، ہم راستہ میں تھے کہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آئی، اور تھوڑی دیر میں سواروں نے ہمارے رتھ کو گھیر لیا۔ ایک آدمی نے پردہ کے سوراخ میں مُنہ ڈالکر جھانکا تو اماں بولیں، کون ہے؟ زنانہ میں کیوں جھانکتا ہے؟ تو جواب ملا۔ میں ہوں میرزا الہی بخش۔ رتھ کے اندر میرزا قویاش تو نہیں ہیں؟ اماں نے کہا۔ ہوش کی خبر لو۔ میرزا قویاش یہاں کہاں؟ میرے بچے اس رتھ میں ہیں۔ اس کے بعد ہڈسن صاحب نے جو رتھ کی دوسری طرف کھڑے تھے اپنے کوڑے سے رتھ کا پردہ اٹھایا، اور میری کوک میں اپنے کوڑے کی نوک لگائی، میں خوف سے کانپنے لگا، مگر جب اُن کو معلوم ہو گیا

کہ میرزا قویاش رتھ کے اندر نہیں ہیں تو وہ گھوڑے دوڑاتے ہوئے قطب صاحب کی طرف چلے گئے۔

سواروں میں ایک ہڈسن صاحب تھے، اور ایک میرزا الٰہی بخش اور دو میرزا صاحب کے اردلی بنجو خاں وغیرہ تھے۔

جب وہ آگے بڑھ گئے تو ہمارا رتھ بھی روانہ ہوا، تھوڑی دور گئی تھے کہ سڑک کے مغربی رُخ جنگل میں میرزا قویاش کو گھوڑے پر سوار کھڑا دیکھا اُن کے سر پر ٹوپی نہ تھی اور چہرہ پر خاک پڑی ہوئی تھی، اور بڑے گھبرائے ہوئے معلوم ہوتے تھے، اور جس گھوڑے پر سوار تھے وہ بہت ہی معمولی درجہ کا معلوم ہوتا تھا، میرزا قویاش نے رتھ کو دیکھا اور مجھ کو پہچانا تو قریب آئے والدہ نے اُن سے فرمایا، میرزا خدا کے لئے جلدی بھاگ، تیری تلاش میں ہڈسن صاحب اور میرزا الٰہی بخش ابھی قطب صاحب گئے ہیں، تھوڑی دیر میں اُلٹے آتے ہونگے اس راستہ سے نہ جانا، کسی اور طرف جانا۔

میرزا قویاش یہ سُنکر اور گھبرا گئے، اور سلام کرکے گھوڑا بڑھا کر جنگل میں چلے گئے اور پھر آج تک اُن کا پتہ نہ لگا کہ وہ کہاں گئے۔ میرزا بلاقی صاحب کا بیان ختم ہوا۔

تین دن کی لوٹ

قبضۂ دہلی کے بعد تین روز تک فوجی سپاہیوں کو دہلی کی لوٹ معاف رہی، جنہوں نے اچھی طرح پیٹ بھر کر جس قدر لوٹا جا سکا لوٹا۔ ان سپاہیوں میں بعض ایسی اقوام کے لوگ تھے جن کا لوٹ کھسوٹ خاندانی پیشہ تھا۔ اسواسطے وہ مال رکھنے کی جگہوں کو بہت اچھی طرح پہچانتے تھے جب وہ گھروں کے اندر

جاتے تو تمام دیواروں کو ہاتھوں سے ٹھپک ٹھپک کر دیکھتے تھے، کیونکہ اُنکو معلوم
تھا کہ اکثر لوگ دیواروں کے اندر روزن بنا کر اُس میں زیور اور روپیہ رکھدیتے
ہیں، اس لیئے جہاں کہیں سے دیوار کے اندر کھوکھلے پن کی آواز آتی وہ اُسکو
کھودتے اور زیور روپیہ وغیرہ نکال لیتے، وہ یہ بھی جانتے تھے کہ لوگ زمین کے
اندر دولت کو دفن کر دیتے ہیں اس واسطے وہ گھروں میں آکر جگہ جگہ پانی بہاتے
اور جہاں دیکھتے کہ پانی جذب ہو گیا اُسی مقام کو کھود کر روپیہ پیسہ نکال لیتے تھے۔
تین روز کے بعد فوج کی درخواست پر حکام نے

پرائز ایجنسی

کے نام سے ایک محکمہ قائم کیا جسکا کام یہ قرار پایا کہ تین دن کی لوٹ کے بعد
شہر میں جو کچھ مال دولت باقی ہو وہ جمع کرا کے اس محکمہ کے ذریعہ نیلام یا فروخت
کرایا جائے اور وہ روپیہ فوج کو تقسیم کر دیا جائے۔

پرائز ایجنسی کے قائم ہونے سے عام لوٹ مار تو بند ہو گئی لیکن پوری طرح
اس کا سدّباب نہ ہوا۔ شہر کے دروازے بند کر دیے گئے تھے تاکہ سپاہی
لوٹ کا مال باہر نہ لیجا سکیں تاہم سپاہی رسّیاں باندھ باندھکر فصیل کے نیچے اُتر
جاتے تھے، آدھے فصیل کے نیچے کھڑے رہتے، آدھے لوٹ کا مال رسّیوں میں
باندھ باندھکر باہر اُن کو پہنچاتے رہتے۔

گوروں نے بالکل نہیں لوٹا

منشی ذکاءاللہ صاحب نے لکھا ہے کہ اس لوٹ مار میں صرف پنجابی اور سرحدی
اور سکھ قومیں شریک تھیں، گورے اور ہندوستانی سپاہیوں نے لوٹ کے مال کو

ہاتھ بھی نہیں لگایا۔

پرائز ایجنسی کا کام یہ تھا کہ اس نے اپنے ماتحت کئی قسم کے عہدہ دار قائم کیئے تھے، کوئی عہدہ دار صرف کتابوں کو جمع کرتا تھا، کوئی برتنوں، چارپائیوں اور چلیوں کو، کوئی دفینوں کو کھدواتا تھا، دفینوں کی کھدوائی کے لیئے انہوں نے یہ حکمت کی تھی کہ راج مزدوروں کو کمیشن دینے کا لالچ دیکر اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ تیغے اور دفینے عموماً راج مزدوروں کے ذریعے تیار ہوئے تھے اسواسطے پرائز ایجنسی کو بہت آسانی کے ساتھ تمام دفینے دستیاب ہو گئے۔

یہ تمام مال واسباب مختلف مقامات پر گوداموں میں بھرا جاتا تھا منصو خاں کی حویلی میں شہر کے اندر تانبے اور پیتل کے برتن رکھے جاتے تھے، پروفیسر رامچندر کی کوٹھی میں کتابیں جمع کی جاتی تھیں۔

کھدائی سارے شہر میں ایسی ہوئی کہ پہلے زمانہ کے روپیہ اور اشرفیاں بھی گڑی ہوئی نکل آئیں کہتے ہیں کہ نواب محمد میر خاں کے مکان میں سے ساٹھ ہزار روپے کا ایک دفینہ ایسا نکلا جسکا حال گھر والوں کو بھی معلوم نہ تھا۔ یہ روپیئے دیک کے سکّہ کے تھے۔

پرائز ایجنسی کو ان طریقوں کے علاوہ ایک اور طریقہ سے بھی بہت سا روپیہ حاصل ہوا اور وہ یہ تھا کہ بڑے بڑے امیروں کو جاں بخشی کی سندیں خاطر خواہ روپیہ دیکر دی جاتی تھیں، مشہور ہے کہ نواب حامد علی خاں اور مفتی صدر الدین خاں اور مکند لال مصر نے اسی طرح زر کثیر دیکر اپنی جانیں بچائی تھیں، ایک صاحب بہادر شاہ کے بیٹے جواں بخت کو ہاتھی کی عماری پر بٹھا کر لال کنوئیں کے قریب جواں بخت کی ماں زینت محل کے محل میں لے گئے اور اُن سے زینت محل کے مال کا پتہ پوچھکر اُس کو وہاں سے نکال لیا۔ مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ صاحب بہادر

کون سکتے اور یہ روپیہ انھوں نے خود رکھا یا پرائز ایجنسی کو دیدیا بعض آدمی
کھانے پینے سے ایسے محتاج ہو گئے تھے کہ انہوں نے خود اپنا مال پرائز ایجنسی
کے کارندوں کو بتایا تاکہ اسطرح کمیشن اُن کو مل جائے بعض ناخلف بیٹوں نے
ماں باپوں کا بعض نے اپنے عزیزوں کا مال بتانے میں حصہ لیا۔ ایک صاحب کا کام
یہ تھا کہ شہر کے محلوں اور بازاروں اور بڑی حویلیوں کے دروازوں کو اکھیڑتے
اور جمع کر کے اُن میں آگ لگا دیتے اور دوسرے دن راکھ کے ڈھیر میں
سے جسقدر لوہا پیتل نکلتا اُس کو اُٹھوا کر لیجاتے۔

ایمان دار فوجی مسلمان

بعض ایماندار فوجی مسلمان ایسے تھے کہ وہ مسلمانوں کے گھروں کو لوٹنا
گناہ جانتے تھے، وہ مسلمانوں کے گھروں میں سے صرف قرآن شریف کو
لے لیتے، اور جس جگہ قرآن کو بُری طرح پڑا ہوا دیکھتے تو چشم پُرآب ہو کر پہلے
اُس کو چومتے اور پھر اُٹھا کر لے آتے،

ایک مسلمان افسر نے دہلی کی مشہور جامع مسجد میں فوج کے ساتھ رہتا تھا
جامع مسجد کے کُل تبرکات اور ہزار بارہ سو روپئے کی چاندی کی کشتی جس میں یہ
تبرکات رکھے جاتے تھے درگاہ شریف کے تہہ خانہ میں سے لے کر وہاں کے
خادموں کو دیدیئے جو آج تک اُنکے پاس موجود ہیں۔

ہندوؤں پر جرمانہ

جب پرائز ایجنسی کے ہاتھ اور طریقوں سے روپیہ آنا بند ہو گیا تو انہوں نے
ہندوؤں سے جرمانہ وصول کر کے محلوں میں آباد کرنا شروع کیا، جرمانہ کی

مقدار کا اندازہ اسی سے کیا جاسکتا ہے کہ صرف نیل کے کٹڑہ کے باشندوں سے ۵۰ ہزار روپیہ لیا گیا تھا، حالانکہ اس محلہ نے لڑائی میں شرکت نہ کی تھی، لیکن تاوان جنگ لیکر صرف ہندو آباد کیئے جاتے تھے مسلمانوں کو مارچ ۱۸۵۹ء تک شہر میں آباد ہونے کی اجازت نہ تھی۔

مسلمانوں کو آباد ہونیکی اجازت

آخر مارچ ۱۸۵۹ء میں خدا کا نیک بندہ سرجان لارنس دہلی میں آیا اور اس نے مسلمانوں کو بھی شہر میں آباد ہونے کی اجازت دی سنہری مسجد میں منشی دیوکی نندن چوکیدارہ کے بخشی آنکر بیٹھے اُن کے پاس چوکیدارہ کا رجسٹر تھا جس میں مکانات کے مالکوں کے نام درج تھے، اس کے مطابق مسلمانوں کو اپنے اپنے گھروں میں آباد ہونے کے لیئے سرٹفکیٹ تقسیم کیئے گئے، اور اس کے ساتھ یہ بھی حکم ملا کہ ڈیڑھ سو روپیہ دیکر دو چارپائیاں اور ایک چکی مول لے لیں۔ اس طرح پرائز ایجنسی کے پاس جو بیشمار چارپائیاں اور چکیاں جمع تھیں وہ چند روز میں فروخت ہوگئیں۔

جب مسلمان اپنے گھروں میں آباد ہوئے تو مکانوں میں نہ کوئی اسباب تھا اور نہ کواڑ تھے، کیونکہ وہ بھی بڑی بے دردی سے ایندھن کی جگہ جلا دیے گئے تھے مسلمانوں کی تباہی کا کچھ ٹھکانا نہ تھا، غدر کے ایک برس بعد مئی ۱۸۵۸ء میں مسلمانوں کی آبادی کا تخمینہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ سابقہ آبادی کے مقابلہ میں ایک چوتھائی بھی نہ تھے،

سنہ ۱۸۵۹ء تک مسلمانوں کے خاص مکانات سرکاری ضبطی میں رہے اور مسلمان شہر کے اندر بغیر کسی افسر کے پاس کے چل پھر نہیں سکتے تھے۔

دہلی کی جامع مسجد

دہلی فتح ہوئی تو مسلمان سپاہی ہندوؤں کے مندروں میں گھس گئے اور اُن کو خراب کر ڈالا۔ اور ہندو سپاہیوں نے مسجدوں کو خراب کیا، دہلی کی بڑی جامع مسجد میں سکھ سپاہیوں کی بارگ بنائی گئی تھی، پاخانے اور پیشاب خانے بھی اسی کے اندر تھے، میناروں کے نیچے حلوے پکائے جاتے تھے، اور سؤر بھی ذبح ہو کر پکتے تھے، کتے جو انگریزوں کے ساتھ تھے اندر بڑے پھرتے تھے زینت المساجد کو گوروں کا اسکوٹ گھر بنایا گیا تھا، شیعوں کی مشہور مسجد جو نواب حامد علی خاں کی مسجد کہلاتی تھی اُس میں گدھے باندھے جاتے تھے۔

قلعہ کے نیچے ایک بڑی عالی شان مسجد اکبر آبادی بالکل مسمار کر دی گئی اور اسی طرح اور بہت سی چھوٹی چھوٹی مسجدوں کا خاتمہ ہوا۔ کوتوالی کے قریب سکھوں کے گردوارہ سے چسپاں ایک مسجد تھی اُس کے ملنے کی درخواست مہاراجہ جیند نے سرکار سے کی اور وہ اُس کو سرکار نے دیدی۔ مہاراجہ نے اُس مسجد کو توڑا اور گوردوارہ میں ملا دیا، چنانچہ وہ ابتک گوردوارہ کے اندر شامل ہے، یہ تمام حالات تاریخ ہند کے صفحہ ۱۵، سے صفحہ ۱۷، تک میں موجود ہیں جو ۱۹۱۰ء میں شمس المطابع دہلی نے چھاپی۔

دہلی کے ہندو کیونکر امیر ہوئے

گو مسلمان سود لینے کو حرام سمجھتے تھے، مگر پرامیسری نوٹوں کے سود لینے کو بعض سنی مسلمان اور کل شیعہ علی العموم حلال جانتے تھے، انکے پاس پانچ سات لاکھ روپئے کے پرامیسری نوٹ تھے جب غدر ہوا تو مسلمانوں کو یقین

تھا کہ اب انگریزی عملداری پھر نہیں آئے گی، اس لئے اُنہوں نے ان نوٹوں کو ۵۔۴ روپے سیکڑہ کے حساب سے بیچ ڈالا اور ہندوؤں کو یقین تھا کہ انگریزی عملداری پھر قائم ہوگی اس لئے اُنہوں نے یہ نوٹ خرید لیئے اور اسطرح ہندوؤں کو کئی لاکھ روپئے مل گئے۔

مسلمانوں کا سارا اسباب جو پرائز ایجنسی نے جمع کیا تھا وہ زیادہ تر ہندوؤں نے نیلام میں بہت ارزاں خریدا اور اس مال و اسباب کی دُکانیں کھولکر خوب روپئے کمائے۔

باغی مُسلمانوں کے جو مکانات ضبط ہوکر نیلام ہوئے وہ سب کے سب ہندوؤں نے بہت سستے داموں میں خرید لیئے جن کی قیمت اب پچاس گنی سے بھی زیادہ ہوگئی ہے ۔ مُسلمانوں کے بڑے بڑے مشہور مکانات جیسے کلاں محل ۔ مرزا نجم بخت کی حویلی ۔ جھجر والوں کی کوٹھی شیش محل ۔ نواب منصور خاں کی حویلیاں جو ایک ایک محلہ کی برابر تھیں، وہ سب ہندوؤں نے خریدیں۔

جن محلوں میں غدر سے پہلے ہندوؤں کی ملکیت ایک مکان بھی نہ تھا غدر کے بعد اُن محلوں میں زیادہ مکانات کے مالک ہندو ہوگئے ۔ مُسلمانوں نے اپنی ضرورتوں کے سبب بچا کھچا ۔ گوٹا ۔ دیا ۔ زیور بہت سستے داموں ہندوؤں کے ہاتھ بیچا، وہ بارہ آنہ تولہ چاندی لیتے تھے اور چودہ پندرہ روپیہ تولہ سونا غرض دہلی کا غدر مُسلمانوں کے لیئے تباہی کی دیوی لایا تھا اور ہندوؤں کے واسطے لکشمی۔

گورنمنٹ کے خیرخواہوں کو انعام

سرکار نے اُن انگریزوں کو جنکا اسباب باغیوں نے لوٹا تھا اور اُن ہندوستانی

خیر خواہوں کو جنکا اسباب انگریزی خیر خواہی کے سبب لوٹا گیا تھا بڑی بڑی شاہانہ فیاضیوں کے معاوضے عطا کیے۔ ایک لاکھ کئی ہزار روپئے مرزا الٰہی بخش کو عطا ہوئے۔ نواب امین اللہ خاں عرف منشی عمو جان کو جو ریاست الور میں سرکار کے خیر خواہ رہے ۱۵ ہزار روپیہ دیا گیا۔ اسی طرح اور بہت سے لوگوں کو۔

دہلی میں مسلمان عورتوں کی مصیبت

جب ہزارہا مسلمان مارے گئے تو اُن کی لاوارث بیویاں کنواری بیاہی لڑکیاں اور بہنیں اور مائیں بے سہارے رہ گئیں، ان میں سے بہت سی عورتوں نے انگریزی فوج کے مسلمانوں سے شادیاں کرلیں، اور بعض نے بدچلنی کا پیشہ اختیار کرلیا، بہادر شاہ کی ایک بیٹی ربیعہ بیگم نے روٹیوں سے محتاج ہونیکے سبب دہلی کے مشہور حسینی باورچی سے شادی کرلی۔ بہادر شاہ کی ایک دوسری بیٹی فاطمہ سلطان پادریوں کے زنانہ اسکول میں معلمی کا پیشہ کرنے لگیں۔ صدہا عورتوں نے اپنے بال جُوں کی شدت سے کٹوا ڈالے اور سر مُنڈوا دیئے ہزاروں شریف عورتیں بھیک مانگنے لگیں۔ اگر کوئی شخص ایک ایک خمیری روٹی یا ایک ایک مُٹھی چنے یا کوڑیاں تقسیم کرتا تو مسلمان عورتوں کے غول کے غول جمع ہوجاتے تھے، یہ وہ عورتیں تھیں جو سال دو سال پہلے خود ہزاروں روپیہ کی خیرات اپنے گھروں میں بیٹھکر کرتی تھیں، دہلی کے مُفتی اعظم مفتی صدر الدین خاں آزردہ نے ایک نظم میں اس وقت کی دہلی کا حال اسطرح سے لکھا ہے۔

آفت اس شہر میں قلعہ کی بدولت آئی — وہاں کے اعمال سے دلّی کی بھی شامت آئی

روز موعود سے پہلے ہی قیامت آئی — کالے میرٹھ سے یہ کیا آئے کہ آفت آئی

گو شنیدہ تھا جو فسانوں سے وہ آنکھوں دیکھا

جو سُنا کرتے تھے کانوں سے وہ آنکھوں دیکھا

جن کو دُنیا میں کسی سے بھی سروکار نہ تھا اہل نااہل سے خلط اُنکو زنہار نہ تھا

ان کی خلوت سے کوئی واقف اسرار نہ تھا آدمی کیا ہے فرشتہ کا بھی واں بار نہ تھا

وہ گلی کوچوں میں پھرتے تھے پریشاں دردر

خاک بھی ملتی نہیں اُن کو کہ ڈالیں سر پر

اسی طرح جناب نواب مرزا صاحب **داغ** دہلوی نے ایک بڑی نظم لکھی ہے جسکا اقتباس درج ذیل کیا جاتا ہے:-

غضب میں آئی رعیت بلا میں شہر آیا

یہ پوربی نہیں آئے خدا کا قہر آیا

زباں سے کہتے ہوئے دین دین آئے لعین جو ماتا دین تھا کوئی تو کوئی گنگا دین

یہ جانتے ہی نہ تھی چیز کیا ہے دین متین کئے تھے قتل زن و بچہ کیسے کیسے حسین

روا نہ تھا کسی مذہب میں جو وہ کام کیا

غرض وہ کام کیا۔ کام ہی تمام کیا

جلی ہیں دھوپ میں شکلیں جو ماہتاب کی تھیں کھچی ہیں کانٹوں پہ جو پتیاں گلاب کی تھیں

نواب محمد مصطفےٰ خاں شیفتہ نواب محمد اسحاق خاں مرحوم کے والد لکھتے ہیں:-

دلّی اب ہی تنِ بیجاں۔ تنِ بیجاں کیا خاک

جان سے جا چکے جو لوگ تھے جانِ دہلی

غمناک سماں

سر جان لارنس کی لائف میں قلعہ دہلی کا ایک غمناک سماں کسی انگریز نے لکھا

ہے جس کو یہاں درج کیا جاتا ہے:-

"ایک بڑے سلسلۂ خاندان شاہی کے آخری بادشاہ کی عالی شان غلام گردشیں اور شاہانہ خلوت سرا عوام الناس کی نگاہ کے روبرو کھلی ہوئی تھیں۔ اور مسلح آدمی جو دوسروں کے نوکر تھے اُس کے آس پاس جمع تھے، بیچارہ بوڑھا بادشاہ جو بمجبوری باغیوں کے ہاتھ کی کٹھ پتلی بنا تھا اپنے محل سے نکالا ہوا ایک علیحدہ کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اور اس کے پھانسی دینے کی تجویزیں ہو رہی تھیں، وہ افسروں اور سپاہیوں کی گالیاں اور گھڑکیاں سُن رہا تھا، شہنشاہ بیگم اُس کی آڑ میں اپنے جسم کو چھپاتی تھیں، تاکہ کسی نامحرم یا ظالم کی نظر نہ پڑ جائے"

سر جان لارنس کی لائف میں دوسری جگہ لکھا ہے کہ گوروں نے دل لگی کے طور پر قلعہ کے لاہوری دروازہ کے سامنے بہادر شاہ کی تصویر بنائی اور تصویر کو پھانسی پر چڑھایا۔

سر جان لارنس کی لائف کا لکھنے والا لکھتا ہے کہ ایک شخص نے دہلی کا چشمدید حال مجکو ان الفاظ میں تحریر کیا:-

"کوسوں تک بجز ایک فاقہ زدہ بلی کے اور ایک بوری مصیبت کی ماری عورت کے جو گودڑ سمیٹتی پھرتی تھی کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ کالج کی عمارت میں یورپین توپ خانہ نصب تھا جامع مسجد جو تمام ہندوستان میں بے نظیر ہے سکھوں کی فوجی بارک تھی، اور ماشل لا جاری تھا۔

سر جان لارنس کی رحمدلی

ایک طرف یہ ہولناک مصائب تھی جنکا بیان کیا گیا۔ دوسری طرف ایک

انگریز کی رحمدلی کام کر رہی تھی جسکا تذکرہ اس مقام پر ضروری معلوم ہوتا ہے
سر جان لارنس کی رحمدلی کا ثبوت ان خطوط سے ہوگا، جو ذیل میں درج کئے
جاتے ہیں، شہزادوں کی نسبت ایک خط میں لکھتے ہیں:۔
"ان کی اچھی طرح تحقیقات کرو، اگر وہ انگریزوں یا اُن کی عورتوں اور بچوں
کے قاتل ہوں یا اُن کے قتل کے معاون ہوں تو اُن کو موت کی سزا دو۔ لیکن
کسی شہزادہ کے ساتھ اس طرح پیش نہ آؤ جسطرح ہڈسن صاحب اپنے کشتوں
کے ساتھ پیش آئے"۔
سر جان لارنس کے اس خط میں آخری فقرہ خاص طور سے قابل غور ہے
سوچنا چاہیئے کہ ہڈسن صاحب اپنے کشتوں کے ساتھ کسطرح پیش آئے۔ کیونکہ اسکا ذکر
تاریخوں میں کہیں نہیں پایا جاتا، سوائے اُن زبانی بیانات کے جنمیں مقتول
شہزادوں کا خون پینے اور اُنکا سر کاٹ کر بادشاہ کے سامنے پیش کرنیکا حال ہے
سر جان لارنس کی اس تحریر سے اُن زبانی بیانات کی صداقت پر روشنی پڑتی ہے۔
نواب جھجر اور راجہ بلب گڑھ کی نسبت لکھتے ہیں:۔
"اُن کو اپنی جنگی صولت جو خونفشانی سے خالی ہو دکھا کر مطیع کرو، اور ان کے
ساتھ انصاف کرنے کا وعدہ کرو"۔
سر جان لارنس کی اس تحریر پر عمل نہیں کیا گیا۔ انہوں نے خون بہانے سے
روکا تھا، مگر ان دونوں کو پھانسیاں دیدی گئیں۔
پھر ۲۶ ستمبر کو جنرل ولسن کے نام لکھتے ہیں:۔
"میں نہیں خیال کرتا کہ اگر شہر کے باشندے اپنے گھروں میں واپس آجائیں گے
تو آپکو اس بات کا خوف پیدا ہوگا کہ دہلی پر کسی طرف سے حملہ ہو جائے گا، کیونکہ
ہماری ۵۰ برس کی حکومت کے عرصہ میں کبھی انہوں نے سرتابی نہیں کی، اگر

ہماری اپنی فوج نے غدر نہ مچایا ہوتا تو وہ اور ۵۰ برس تک خاموش رہتے، میں ان تمام مصائب سے قطع نظر کرکے جو باشندگان دہلی کو پیش آئے۔ یہ کہتا ہوں کہ اگر کشمیری دروازہ پر چند سر لٹکا دیئے جائیں تو پھر کسی طرح کا خوف و خطر نہیں ہے"

دہلی کے فتح ہونے کے دس روز بعد ۳۰ ستمبر ۱۸۵۷ء کو اُنہوں نے مسٹر برن فوجی گورنر دہلی کے نام یہ خط لکھا:۔

"شہر کے باشندوں کی نسبت میری یہ رائے ہے کہ جب قلعہ کی محافظت کا بندوبست خاطر خواہ ہو جائے تو اُن کو رفتہ رفتہ احتیاط کے ساتھ شہر میں واپس بُلا لینا چاہیئے شہر کے ڈرانے کے لیئے چاندنی چوک کے سامنے جو پھاٹک ہے اس پر توپ چڑھا نہ کے لگانے سے سب طرح اطمینان رہے گا۔ باغیوں کے جو سرغنہ ہیں اُن کو پھانسی دی جائے، مگر اور لوگوں کے ساتھ نرمی برتنی چاہیئے۔ ۹۰ فی صدی باشندوں کو اس غدر سے کچھ علاقہ نہ تھا، اگر اُن سے ہو سکتا تو وہ ہماری مدد کرتے۔ ہم خود اپنی حماقت اور کمزوری کے سبب ان کی حفاظت نہ کر سکے، ورنہ ان کو مجبور کر کے بغاوت میں شریک نہ کیا جاتا"

چارلس سانڈرس صاحب کمشنر دہلی کو ۶ اکتوبر کے خط میں لکھا:۔

"مناسب شرطوں کے ساتھ شہر کے تمام باشندوں کو واپس بُلا لینا چاہیئے۔ اب سب سے زیادہ تکلیف عاجز و بے قصور باشندوں ہی کو ہے"

نیول چمبرلین کے نام ۸ اکتوبر کو لکھتے ہیں:۔

"میں کسی طرح اس بات کی صلاح نہیں دیتا کہ شہزادے یا اس قسم کے مفسد بلا تحقیقات قتل کیئے جائیں، ان کو تحقیقات کا موقع دینا چاہیئے۔ بوڑھا بادشاہ اگر بھاگ گیا ہوتا تو اس کو گولی سے اُڑانا واجب تھا لیکن جبکہ وہ بھاگا نہیں تو میں یہ رائے نہیں دیتا۔ میری رائے ہے کہ بادشاہ نے مقتضائے وقت کے موافق کام کیا"

جامع مسجد کو ڈہا دو یا گرجا بنادو

دہلی کے اکثر انگریز یہ چاہتے تھے کہ جامع مسجد کو ڈہا دیا جائے یا اس کو گرجا بنا دیا جائے، اور سنگ مرمر کے مصلوں پر ان انگریزوں کے نام کندہ کیے جائیں جو غدر میں مارے گئے تھے، اس معاملہ میں ہر انگریز کو اصرار تھا کہ جامع مسجد کو گرجا بنانا یا توڑنا بہت ہی ضروری ہے، کیونکہ یہ مسجد ہندوستان کے مسلمانوں کا مذہبی دل ہے۔ اس کے مسمار کرنے یا گرجا بنانے سے تمام مسلمانان ہندوستان کے دل پر ضرب پڑے گی جس کی اظہارِ غلبہ و اقتدار کے لیے سخت ضرورت ہے، اس واسطے سر جان لارنس کے پاس بکثرت تحریریں جاتی تھیں اور انکو جامع مسجد کے فیصلہ کے لیے مجبور کیا جا رہا تھا، چنانچہ برن صاحب کے جواب میں سر جان لارنس نے لکھا:۔

"اس باب میں میں کسی طرح رضامند نہیں ہوں گا۔ مذہبی عمارتوں کے انہدام سے ہم کو احتراز کرنا چاہیئے۔ یہ کام نہ دوستوں کی خوشی کے لیے مناسب ہے نہ دشمنوں کی آزادی کے لیے زیب دیتا ہے"

بہت سے انگریز کہتے تھے دلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دینی چاہیئے اور اور جامع مسجد کو تو گرجا بنانا بہت ہی ضروری ہے۔ اس کے میناروں پر صلیب لگائی جائے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ "جو انگریز مسجد کو دوبارہ مسلمانوں کے حوالہ کر دینا چاہتے ہیں وہ پاگل ہو گئے ہیں" جامع مسجد کے معاملہ میں فوجی افسروں انگریزوں کا اصرار حد سے بڑھ گیا جسمیں دہلی اور پنجاب کے تمام انگریز شامل تھے یہاں تک کہ وہ خود سر جان لارنس کے پاس گئے اور ان کو مجبور کیا کہ جامع مسجد کے معاملہ میں آپکو ہمارے موافق رائے دینی چاہیئے۔ تو سر جان نے بہت

نرمی سے دلیلیں بیان کرنی شروع کیں، اور جامع مسجد کو توڑنے یا گرجا بنانے کی مخالفت کی لیکن جب اس نرمی اور دلیل بازی کا انگریزوں پر کچھ اثر نہ ہوا تو وہ غضبناک ہو کر کھڑے ہو گئے، اور انہوں نے کہا:۔

"میں یہ رائے ہرگز نہ دونگا، بہت سے ایسے امور ہیں جنکے لئے تم اصرار کرسکتے ہو، لیکن جامع مسجد کے بارے میں مجھ سے کبھی اصرار نہ کرنا۔ مناسب یہی ہے کہ مجھے اس معاملہ میں مجبور کرنے کی تکلیف نہ دی جائے۔"

لارڈ کیننگ کو لکھتے ہیں۔ اسوقت جبکہ دہلی میں پرائز ایجنسی کی لوٹ مار جاری تھی۔

"اگر جناب اس کو شہر کی حیثیت سے قائم رکھنا چاہتے ہیں تو میرے نزدیک پرائز ایجنسی کی کارروائیوں کو روکنا چاہیئے، جب تک ہندوستانی باشندوں کے جان و مال کی محافظت نہیں کی جائے گی تب تک امن و امان کا قائم ہونا دشوار ہے، جو لوٹ مار اس وقت برابر ہو رہی ہے اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام ہندوستانی آشفتہ و برہم ہو جائیں گے اور ہمارے اور ان کے درمیان اسوقت جو رخنہ پڑا ہوا ہے وہ ہمیشہ کے لئے اور کشادہ ہو جائے گا۔"

اسی زمانہ میں انہوں نے لارڈ الفنسٹن کو لکھا:۔

"اگر دہلی میں مارشل لا اور پرائز ایجنسی موقوف کر دی جائے تو بخوبی اصلاح ہو سکتی ہے۔"

پھر اسی زمانہ میں جنرل پنی کو بڑے زور کے ساتھ لکھتے ہیں:۔

"اگر ہم سے اعلیٰ دماغی کارروائیاں نہیں ہو سکتی ہیں تو بھی معمولی پالیسی کے اعتبار سے ہم پر لازم ہے کہ اپنے ہم وطنوں کو ظلم و تعدی سے باز رکھیں۔ اگر ہم سزا دینے میں دوست دشمن کی تمیز نہ کریں گے تو تمام ہندوستان ہمارا مخالف ہو جائیگا، اور ملک کے گوشہ گوشہ میں ہمسے لڑائیاں شروع ہو جائیں گی،

اور جب ہندوستان اسقدر گرم ہو گیا تو ہمارا اس ملک میں رہنا دشوار ہو جائے گا۔"

اس خط کا بہت اچھا اثر ہوا چنانچہ اس کے ایک ہفتہ کے بعد جنرل پنی کو لکھتی ہیں:-

"میں آپکا بہت ممنون ہوں کہ آپ نے لوٹ مار کے روکنے میں بہت جلد کارروائی کی۔ مجھے اس بات کے سُننے سے نہایت افسوس ہوا کہ ہمارے ملک کے لوگ بے سبب ہندوستانیوں کو مار ڈالتے ہیں، حالانکہ ان کو اس کے اختیارات نہیں ہیں کہ مجرم و بے جرم لوگوں میں سزا دیتے وقت کچھ تمیز نہ کریں۔"

جب انہوں نے دیکھا کہ میرے لکھنے کا افسران دہلی پر اثر نہیں ہوتا تو وہ خود ۲۴ فروری ۱۸۵۸ء کو دہلی میں آئے اور یہاں آکر پہلا کام اُنہوں نے یہ کیا کہ دہلی کے تمام خاص خاص افسروں کو اپنے پاس بُلایا۔ جن میں چارلس سانڈرس فلپ ایجرٹن۔ نیول چیمبرلین وغیرہ بھی تھے اور اُن کو مخاطب کر کے نہایت نرمی سے حسب ذیل تقریر کی:-

"میں تسلیم کرتا ہوں کہ خاص خاص حالتوں میں شر و فساد روکنے کے لیئے خاص خاص تدبیریں جائز تھیں، لیکن اب ان تدبیروں کا زمانہ گزر گیا، اب تو اس بات کی ضرورت ہے ہندوستانیوں میں امن و امان قائم کیا جائے اور اُن کے دلوں میں اپنا اعتماد جمایا جائے۔"

اس کے بعد ہی اُنہوں نے لارڈ کیننگ کو تار دیا جس کے الفاظ یہ تھے:-

"جن افسروں کو پھانسی دینے اور رہا کرنے کا اختیار دیا گیا تھا اُنہوں نے اپنے اختیار کو بُری طرح استعمال کیا، لہٰذا مجھ کو ان کے اختیارات سلب کرنے کی اجازت عنایت فرمایئے، تاکہ گورنمنٹ کی منظوری کے بغیر کوئی کسی کو موت کی سزا نہ دے سکے۔"

دہلی میں انکے بڑے عزیز سکریٹری رچرڈ ٹمپل آ گئے تھے، اُنہوں نے حالات

کا مشاہدہ کرکے ان کے پاس حسب ذیل رپورٹ بھیجی:۔

"شہر میں بالکل امن و امان ہے۔ خوف کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے لیکن لوٹ مار و خونریزی ابتک جاری ہے، ہندوستانیوں کے رنگ فق ہیں وہ اب بھی کثرت سے گرفتار ہوتے ہیں اور اکثر پھانسی پاتے ہیں یا قید کیے جاتے ہیں"۔

غرض وہ مارچ کے تیسرے ہفتہ میں دہلی سے روانہ ہوگئے، اور مسلمانوں کو شہر میں آنے کی اجازت دے گئے، اور جنرل کمانیر کو مسلمانوں کی محافظت کی سخت تاکید کر گئے، جامع مسجد مسمار نہیں ہوئی، شہر کے باشندے جلاوطن نہیں کیے گئے، اور یہ خواہش پوری نہیں ہوئی کہ دہلی کی تاریخی یادگاروں پر ہل چلا دیا جاتا، ایک انگریز لکھتا ہے:۔

"جس طرح روم کے قیصروں نے شہر "کارتھیج" اور "کورنتھ" کو مسمار کرکے لعنت کے طوق اپنی گردنوں میں ڈالے تھے، اسی طرح انگریزوں کی گردنوں میں بھی دہلی کو مسمار کرکے ہمیشہ کے لیے وہ لعنت کے طوق پڑ جاتے مگر سر جان لارنس نے اس دوامی بدنامی سے انگلش قوم کو بچا لیا جب ان کے آس پاس بیٹھنے والے انکو سختی پر مجبور کرتے تو وہ کہتے تھے، کیا میں ہندوستانیوں کو مار ڈالوں؟ کیا میں اس شہر کو جو نینوا کے مقابلہ کا ہے نہ بچاؤں؟" ایک دوسرا انگریز لکھتا ہے:۔

"انگلش قوم میں اور کل شہنشاہی اقوام میں ایک فرقہ ایسا ہوتا ہے جس کی صورت تو انسانوں کی ہوتی ہے اور سیرت درندوں کی۔ ان کا میلان طبع یہ ہوتا ہے کہ جس طرح ممکن ہو مغلوب قوم کو خوفزدہ کیا جائے، اگر سر جان لارنس نہ ہوتے تو دہلی کی جامع مسجد ایک ٹوٹا ہوا ڈھیر ہوتی جسمیں جانوروں کے بلوں اور گھونسلوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا"۔

۲۵ نومبر کو لارڈ الفنسٹن گورنر بمبئی نے سر جان لارنس کو لکھا:-

"دہلی فتح ہونے کے بعد دوست دشمن میں کچھ تمیز نہیں کی گئی۔ دہلی میں نادر شاہ کے وقت سے بھی زیادہ لوٹ ہوئی"

سر جان لارنس نے جو رپورٹ گورنمنٹ ہند کو بھیجی تھی اُس میں ایک یہ فقرہ ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیسے خدا پرست تھے:-

"ہمارے اور باغیوں کے سر پر ایک عادل فرمانروا ہے، اُسی کے فضل و کرم سے یہ آئی ہوئی بلا ٹلی ہے، پس جب خدا نے ہم پر رحم کیا، ہم کو بھی اُس کے بندوں پر رحم کرنا چاہیئے"

بہادر شاہ کا انجام

قصہ مختصر سر جان لارنس کی کوشش سے بہادر شاہ کو جان سے نہیں مارا گیا بلکہ چند روز ایک مقدمہ کی کارروائی کر کے اُن کو رنگون بھیج دیا گیا۔ زینت محل بیگم اور تاج محل بیگم اور جواں بخت ان کے ساتھ بھیجے گئے، ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء سے ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء تک بہادر شاہ کی بادشاہی میں اس طرح کی حکومت ہوئی کہ پہلا حکم بادشاہ کی طرف سے یہ صادر ہوا کہ گائے کا ذبح کرنا بند کیا گیا۔ ۹ جولائی ڈھنڈورا پٹوایا گیا کہ جو شخص گائے ذبح کرے گا وہ توپ کے منہ اُڑایا جائیگا۔ اسکے بعد یہ حکم صادر ہوا کہ بقر عید کے موقع پر بھی کوئی شخص گائے کی قربانی نہ کرنے پائے۔

چار مہینے تک گائے قصاب اپنے گھروں میں چھپے بیٹھے رہے، اگر ان میں سے کوئی شخص باہر نکلتا تھا تو ہندو سپاہی اُس کو پکڑ کے ذبح کر ڈالتے تھے اور کہتے تھے جس طرح تم ہماری گائے کو ذبح کرتے ہو ہم تمہیں ذبح کرتے ہیں"

اس کے بعد بادشاہ سے حکم جاری کرایا کہ شہر کا ڈلاؤ اور کوڑا جو بیلوں پر لاد کر

کھیتوں میں ڈالنے کے لیئے حلالخور رے جاتے ہیں وہ آئندہ گدھوں پر لد کر جایا کرے
بیلوں کی گائے سے قرابت داری ہے، اور ڈلاؤ لادنے میں بیلوں کی توہین ہوتی
ہے، چنانچہ اس حکم پر عمل کیا گیا، حلال خوروں نے اپنے بیل بیچ ڈالے اور انکے
بدلے گدھے مول لے لیئے مسلمانوں کو یہ احکام ناگوار گزرے اور اُنھوں نے
کہا یہ اسلام کی بادشاہی نہیں یہ تو ہندوؤں کا راج ہے چنانچہ مولوی محمد سعید
نامی ایک شخص نے جامع مسجد دہلی میں جہاد کے لیئے محمدی جھنڈا کھڑا کیا۔ اس کی
خبر بادشاہ کو ہوئی، اُنھوں نے مولوی صاحب کو بُلا کر پوچھا کہ انگریز تو اب
شہر میں باقی نہیں رہے یہ جھنڈا کس کے واسطے لگایا ہے۔ مولوی صاحب
نے جواب دیا۔ ہندوؤں کے لیئے۔ جنھوں نے آپ کو اپنا تابعدار بنا لیا ہے،
بادشاہ نے اُن کو سمجھایا کہ تمام باغی فوج ہندو ہے مسلمان اُن سے لڑ نہیں
سکتے، آخر بہزار دقت یہ جھنڈا اُکھڑوا دیا گیا۔

شہر میں انتظام کی یہ حالت تھی کہ اکثر بازار بند رہتا تھا۔ کھاری باؤلی چاندنی
چوک ۔ دریبہ ۔ چاوڑی میں اکثر دوکانیں دن دہاڑے لُٹ جاتی تھیں، اس کی
شکایت بادشاہ سے کی گئی کہ دوکانیں اکثر بند رہتی ہیں اور ضرورت کی چیزیں
دستیاب نہیں ہوتیں، بادشاہ ان کی درخواست کے موافق خود ہاتھی پر سوار
ہو کر بازار میں نکلے، شاہی چتر۔ ماہی مراتب شتری زنبورکیں، اگرلی اور کالی
پلٹنیں جلوس میں ساتھ تھیں، سینکڑوں تلنگے دھوتیاں باندھے غول کے غول
سواری کے آگے آگے بہادر شاہ بادشاہ کی جے ۔ دین دُنیا کے گتیاں کی جے
پکارتے جاتے تھے، شاہی نقیب احکام سُناتے جاتے تھے کہ دُکانیں
کھولو۔ سواری کے پیچھے ترک سواروں کا جمگھٹا تھا، جو اللہ اکبر کے نعرے لگاتے
تھے، اس جلوس کا اثر یہ ہوا کہ بازار کھل گیا،

غدر سے پہلے ڈھنڈورا اسطرح پیٹا جاتا تھا کہ نقارہ پر چوب لگا کے ڈھنڈورچی اوّل یہ کہتا تھا "خلقت خدا کی، ملک بادشاہ کا۔ حکم سرکار کمپنی بہادر کا"۔ غدر کے بعد حکم سرکار کمپنی کا لفظ اُڑا دیا گیا اور اس کی جگہ حکم بادشاہ داخل ہو گیا۔

تلنگوں کے مظالم

باغی سپاہی مختلف اسباب سے باشندگان شہر کو قتل کرتے تھے، کسی کو عیسائی سمجھکر اور کسی کو انگریزوں کا جاسوس خیال کر کے، سیٹھ بدری چند ڈپٹی انسپکٹر مدارس دہلی کو جو بڑے پکے سراوگی ہندو تھے، عیسائی سمجھکر مار ڈالا کیونکہ وہ انگریزی کوٹ پتلون پہنتے تھے، ایک کشمیری پنڈت موہن لال نامی مسلمان ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنا نام آغا حسن جان رکھا تھا مگر وہ بھی کوٹ پتلون پہنتے تھے، تلنگوں نے انکو کرسٹان سمجھکر پکڑا اور قتل کرنا چاہا لیکن اتفاق سے میاں نظام الدین صاحب چشتی نظامی وہاں تشریف لے آئے اور انہوں نے پنڈت جی کے مسلمان ہونے کی شہادت دیکر جان بچائی۔

بعض شریر آدمی اپنی ذاتی عداوتوں کے سبب تلنگوں سے جاکر کہتے کہ فلاں گھر میں انگریز چھپے ہوئے ہیں، تلنگے اس گھر پر چڑھ دوڑتے اور تلاشی لیکر گھر کو لوٹ لیتے چنانچہ ریاست الور کے ملازم قاضی بنو نامی کے سگے بھانجوں نے ذاتی عداوت کے سبب جھوٹی مخبری کر کے بچارے ماموں کو بے گناہ قتل کرادیا اور اُسکا گھر لٹوا دیا۔ ۱۲ مئی کو نواب حامد علی خاں کی نسبت جو بادشاہ کے خاص مقرب تھے رپورٹ کی گئی کہ ان کے گھر میں فرنگی پوشیدہ ہیں تلنگوں نے نہایت بیحرمتی سے نواب صاحب کو گرفتار کیا اور کشاں کشاں قلعہ میں بادشاہ کے سامنے لائے بادشاہ نے مرزا ابوبکر کو نواب صاحب کے گھر پر بھیجا کہ تلاشی لو۔ اگر کوئی انگریز وہاں پوشیدہ ہے، تب تو یہ خطاوار ہیں ورنہ انکو چھوڑ دیا جائے۔ تلاشی میں کوئی انگریز نہیں نکلا اس لئے نواب صاحب چھوڑ دیئے گئے۔ ۱۳ مئی کو نراین داس نہر والہ کے

متعلق اطلاع آئی کہ اس کے گھر میں انگریز چھپا ہے، تلنگے گئے۔ مکان کی تلاشی لی اور دو انگریز دستیاب ہوئے جنکو قتل کردیا گیا اور رلا لہ کا مکان لوٹ لیا گیا، اسی طرح ایک درزی کے گھر سے تین انگریز نکالے گئے اور قتل کیے گئے اور اُسکا گھر لوٹا گیا۔ غرض اس شبہ میں دو چار آدمیوں کی کمبختی روزانہ آتی تھی۔

باغیوں کا محکمہ جاسوسی

باوجود جاہل ہونے کے باغیوں کا محکمہ خبر رسانی بہت اعلیٰ درجہ کا تھا، اُن کو شہر کی خبریں بہت صحیح ملتی تھیں اور وہ جانتے تھے کہ دہلی میں کون کون لوگ انگریزوں سے سازش رکھتے ہیں اور اُن کو خبریں بھیجتے ہیں، اور ان کی فوج کے لئے رسد کا سامان مہیا کرتے ہیں، چنانچہ اس شبہ میں اُنہوں نے بہت سے لوگوں کو گرفتار کیا جن میں سے بعض مارے گئے اور بعض شاہی سفارش سے چھوڑ دیئے گئے۔ چنانچہ مان سنگھ اور تراب علی جو واقعی انگریزی مخبر تھے گرفتار کیے گئے مگر شہزادوں نے سفارش کرکے چھڑا لیا، بادشاہ کے وزیر محبوب علی خاں اور حکیم احسن اللہ خان اور بیگم زینت محل کی نسبت بھی انکو جاسوسی کا شبہ تھا، چنانچہ محبوب علی خان اور حکیم احسن اللہ خان بھی گرفتار کیے گئے مگر بادشاہ کی سفارش سے بمشکل رہائی پائی، راجہ اجیت سنگھ مہاراجہ پٹیالہ کے چچا دہلی میں رہتے تھے ان کو دو دفعہ گرفتار کیا گیا اس الزام میں کہ وہ پٹیالہ اور انگریزی فوج کے پاس خبریں بھیجتے ہیں، مگر بادشاہ کی سفارش سے راجہ صاحب بھی رہا ہو گئے بلدیو سنگھ نامی ایک شخص کو جو کوڑیا پل پر رہتا تھا مخبری کے الزام میں گولی سے قتل کیا گیا اور اُس کی لاش کوتوالی کے سامنے اُلٹی لٹکائی گئی۔ پیارے لال مدرس کو مخبری کے الزام میں توپ سے اُڑا دیا گیا۔ رائے رام سرن داس ڈپٹی کلکٹر کے رشتہ داروں کے گھر مخبری کے الزام میں لوٹے گئے، کنھیالال حیدرآبادی اور میر حسن علی وکیل پٹیالہ بھی مخبری کے الزام میں گرفتار ہوئے کشمیری اور موری دروازہ کے نان بائیوں کو اس جرم میں مار ڈالا گیا کہ وہ ڈبل روٹیاں

پکاکر پہاڑی پر انگریزوں کو بھیجتے ہیں، نواب محبوب علی خاں، اور حکیم احسن اللہ خان پر روزانہ طرح طرح کے الزام لگائے جاتے تھے، کبھی یہ کہ انہوں نے چوڑی والوں کا میگزین اُڑادیا، کبھی یہ کہ وہ انگریزوں کے پاس میگزین بھیجتے ہیں، کبھی یہ کہ اُنہوں نے سلیم گڑھ کی توپوں میں کنکر پتھر بھروادیئے۔ کبھی یہ کہ انہوں نے توپوں میں میخیں ٹھکوادیں، لیکن ان دونوں کے حلف اُٹھانے اور بادشاہ کے بار بار سفارش کرنے سے انکی جانیں بچ گئیں درحقیقت ان لوگوں کی بڑی بدقسمتی تھی کہ غدر میں تو باغی ان پر شبہ کرتے تھے اور غدر کے بعد انگریزوں نے ان پر شبہ کیا اور حوالات میں مقید رکھا۔

تلنگوں کی لوٹ مار!

گامی خاں پنجابی شہر کا ایک مشہور بدمعاش تھا۔ پیچھے اسکا بہت ذکر آیا ہے۔ اس نے انگریزی فوج کے ہاتھوں بہت لوگوں پر ظلم کرائے تھے لیکن غدر میں یہ باغیوں کی ناک کا بال بنا ہوا تھا اور اُن کے ہاتھ سے شہر والوں پر ظلم کراتا تھا چنانچہ اس نے اپنے ہی بھائی بندوں ولی محمد و حسین بخش و قطب الدین کی دکانوں کو تلنگوں کے ہاتھ سے لٹوادیا۔ سب سے بڑے پنجابی سوداگر دہلی میں یہی تین تھے۔

غرض بیچارے دہلی شہر کو ۴ مہینے اور چار دن اس بادشاہی میں بھی کسی طرح کا آرام و چین میسر نہ تھا، اور اس کی جانکنی انگریزوں کے دہلی فتح کرنے کے بعد سے نہیں بلکہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے شروع ہوگئی تھی جس دن کہ باغیوں کا اس شہر پر قبضہ ہوا تھا۔

نتیجہ

ان تمام حالات پر مورخانہ و دوراندیشانہ غور کرنے سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ امن بہت بڑی دولت ہے اور بے امنی میں بڑی سخت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آج جو لوگ

انگریزوں کو اس ملک سے بزور قوت بازو نکال دینا چاہتے ہیں اُن کو ذرا تخلیہ میں بیٹھکر یہ کتاب پڑھ لینی چاہیئے، اُس وقت اُن کو معلوم ہوگا کہ جذبات عارضی سے مشتعل ہو جانا اور آنکھیں بند کرکے کوئی کام کر بیٹھنا بیگناہوں پر کیسی کیسی تباہیاں لاتا ہے۔

میں اُن لوگوں میں ہوں جو صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ تمام دُنیا سے ہتھیاروں کی قوت کو اور لڑائی بھڑائی کے جذبات کو دور کر دینے کے آرزومند ہیں، اس واسطے یہ کتاب کسی قوم یا فرقہ کے خلاف نہیں سمجھنی چاہیئے، اسکا مقصد تحریر سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ انسان دردناک اور موثر مصیبتوں کا حال پڑھکر ان حرکات اور خیالات اور ارادوں سے باز آجائے جو امن شکنی کا باعث ہوتے ہیں۔

بتاریخ ۶/اپریل ۱۹۲۲ء یوم چہارشنبہ کو ظہر کے بعد یہ کتاب شروع کی گئی تھی اور آج ۱۶-اپریل یوم یک شنبہ دن کے سوا دس بجے اس کی تحریر پوری ہوئی۔ الحمد للہ۔

حسن نظامی

اشاعت ثانی!

مئی ۱۹۲۲ء میں یہ کتاب پہلی بار شائع ہوئی تھی چھ ماہ کے بعد اب دسمبر ۱۹۲۲ء میں دوسری بار چھپتی ہے جو اس کی غیر معمولی مقبولیت کی علامت ہے۔

حسن نظامی

(۲۰ دسمبر ۱۹۲۲ء)